Regd. L. No.7243

Phone. 8080

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1973

اس پرچہ میں

- مساواتِ محمدی
- آئینِ پاکستان
- تفہیم القرآن پر تنقید

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک
پاکستان ــــ دس روپے
غیر ممالک ــــ ایک پونڈ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲، لاہور

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

جلد (۲۶) | جون - سنہ ۱۹۷۳ء | نمبر (۶)

فہرست

۱. لمعات ــــ ۲
۲. طلوعِ اسلام کالج فنڈ ــــ (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) ــــ ۷
۳. آئینِ پاکستان سنہ ۱۹۷۳ء ــــ ۹
۴. حقائق و عبر ــ مکتوں کو مصاحب ڈھوتے ہیں ــ بابالاسلام ، سندھ ــــ ۱۹
(اقبالیات)
۵. رابطۂ باہمی ــــ ۲۴
(۶) تفہیم القرآن جلد پنجم پر ایک نظر ــــ (شاہد عادل) ــــ ۲۵
(۷) مساواتِ محمدی ــــ (محترم پرویز صاحب) ــــ ۴۱

مدیر : خلیل - ناشر : سراج الحق - مقام اشاعت : ۲۵/بی گلبرگ ۲ - لاہور - پرنٹر : شیخ محمد اشرف - مطبوعہ : اشرف پریس ایبٹ روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہم سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کی خصوصیاتِ کبریٰ کیا ہوں گی۔ مستفسرین کا اس سوال سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انہیں بتایا جائے کہ اس نظام میں اطاعت صرف احکام خداوندی کی ہوگی (وغیرہ وغیرہ) انکا مقصد اس سوال سے یہ ہوتا ہے کہ وہ کون سی متاعِ گراں بہا ہوگی جو اس مملکت میں رہنے والوں کو میسر ہوگی۔ ان کی زندگی کس قسم کی ہوگی۔ ان کی کیفیات کیا ہوں گی اور ان کی مفادات کیا؟ ان سوالات کا جواب اگر ایک لفظ میں دیا جائے تو بلا تامل کہا جا سکے گا کہ ان کی زندگی وہ ہوگی جسے قرآن کریم نے "جنت کی زندگی" کہہ کر پکارا ہے۔ لیکن یہ جواب مجمل ہی رہیگا۔ اس کی تفصیل کے لئے ضروری ہوگا کہ اس زندگی کے ایک ایک گوشے کو سامنے لایا جائے جسے قرآن نے جنتی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ تفصیل فرصت اور گنجائش چاہتی ہے جو ہمیں سردست میسر نہیں (اسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں) اس وقت ہم اس زندگی کی صرف ایک خصوصیت کو سامنے لائینگے۔ اور یہ وہ خصوصیت ہے جسے قرآن کریم نے سرفہرست رکھا ہے۔

سورۂ بقرہ میں بیان کردہ قصۂ آدم کو سامنے لایئے۔ مقام وہ ہے جہاں آدم جنت سے نکالا گیا ہے۔ یعنی وہ ان کیفیات وخصوصیات سے محروم ہو گیا ہے جو اسے جنتی زندگی میں حاصل تھیں۔ اس کے دل میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ شاید یہ محرومی ابدی ہے؟ یا اس فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کا امکان بھی ہے؟ جواب ملتا ہے کہ آدم! مایوسی کی کوئی بات نہیں تمہیں جنتی زندگی پھر بھی مل سکتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی "ہماری طرف سے تمہارے پاس ہدایات آئینگی"۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ۔ سو جو بھی ان ہدایات کا اتباع کرے گا اسے یہ فردوسِ گم گشتہ پھر سے مل جائے گی اس کی نشانی یہ ہوگی کہ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (۲/۳۸) ان لوگوں کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ یعنی اتباعِ وحی سے جو جنتی زندگی حاصل ہوگی، اس کی خصوصیتِ کبریٰ یہ ہوگی کہ اس میں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ اسے قرآنِ کریم نے متعدد مقامات میں دہرایا ہے۔

لغت کی تفصیلات میں گئے بغیر، اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ کوئی محسوس خطرہ جو سامنے ہو، اس سے پیدا شدہ کیفیت کو خوف کہا جاتا ہے۔ لیکن جب کیفیت یہ ہو کہ کوئی متعین اور محسوس خطرہ تو سامنے نہ ہو لیکن انسان اپنے آپ کو غیر محفوظ (INSECURE) پائے۔ طرح طرح کے خدشات اور وساوس اس کے دل میں گذریں۔ ہر لمحہ اس کا دل دھڑکے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے ۔۔۔ اس سے ذہنی پریشانی اور قلبی افسردگی کی جو کیفیت پیدا ہو، اسے حزن سے تعبیر کیا جائے گا۔ قرآن کریم نے ان دونوں کیفیات کو وضاحت سے بیان کر دیا ہے تاکہ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کا صحیح مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ (مثلاً) مدینہ میں اسلامی مملکت کے قیام کے بعد جماعت مومنین کو ان کی سابقہ (مکی) زندگی کی یاد ان الفاظ میں دلائی گئی کہ:-

وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَ اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (۸/۲۶)

تم اس زمانے کو یاد کرو جب تم تعداد میں بھی قلیل تھے اور قوت کے اعتبار سے بھی بہت کمزور تمہیں ہر وقت اس امر کا خوف ستاتا تھا کہ بالادست قوتیں کہیں تمہیں اچک کر نہ لے جائیں۔ ایسی حالت میں خدا نے تمہیں ایک پناہ گاہ بھی دی اور اپنی نصرت سے تمہیں امداد بھی دی تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر سکیں۔

یہ ہے مفہوم خوف سے۔ اس میں ایک محسوس خطرہ سامنے ہوتا ہے۔ دوسری طرف حُزن کے لیجئے۔ بیٹے کی گمشدگی کے بعد حضرت یعقوبؑ کا دل طرح طرح کے وساوس کی آماجگاہ بن رہا تھا — نہ معلوم بیٹا زندہ ہے یا کسی آفت کا شکار ہو چکا ہے۔ اگر زندہ ہے تو وہ کس حالت میں ہے۔ ان غیر متعین وساوس اور موہوم خدشات سے ان کے قلبِ حزیں کی جو کیفیت تھی اُسے قرآن نے حُزن سے تعبیر کیا ہے۔ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ۔ (۱۲/۸۴) اس حُزن کی وجہ سے (حضرت) یعقوبؑ کی آنکھیں سفید ہوگئیں۔ جب دوسرے بیٹے انہیں طعن دیتے کہ آپ یوسفؑ کے غم میں اپنے آپ کو ہلاک کر لیں گے تو وہ جواب میں کہتے کہ میں تم لوگوں سے تو کچھ نہیں کہتا۔ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔ (۱۲/۸۶) میں تو اپنے غم اور حزن کا شکوہ صرف اپنے خدا سے کرتا ہوں۔ اس سے حُزن کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یا (مثلاً) جب سفرِ ہجرت میں حضورؐ نبی اکرم اور ان کے یارِ غار (حضرت صدیق اکبرؓ) ایک غار میں چھپے بیٹھے تھے تو وہاں وہ اپنے آپ کو بالکل غیر محفوظ (INSECURE) پاتے تھے۔ اس عدم تحفظ اور فقدانِ مصئونیت کی وجہ سے حضرت صدیقؓ کے دل میں جو خیالات گذر رہے تھے ان کے احساس سے حضورؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۹/۴۰) مت محزون ہو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ ان مقامات سے خوف اور حزن کے معانی واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ لہٰذا جب خدا نے کہا کہ اتباعِ وحی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ خوف باقی رہیگا نہ حزن۔ تو اس سے مراد یہ تھی کہ اس زندگی میں نہ محسوس خطرات تمہارے لئے وجہِ پریشانی ہوں گے (کہ ان سے حفاظت کا پورا پورا سامان تمہیں میسر ہوگا) اور نہ ہی عدمِ تحفظ کا احساس (حزن) تمہارے لئے باعثِ دل گرفتگی اور وجہِ افسردگی ہوگا۔

قرآن کریم نے "بھوک اور خوف" کو خدا کا عذاب قرار دیا ہے۔ (۱۶/۱۱۲) اور ان سے مامونیت کو اللہ کا انعام۔ (۱۰۶/۴) خوف میں بیرونی قوتوں کی طرف سے خطرات بھی شامل ہیں اور اندرونی نظم و نسق کی خرابیوں سے پیدا شدہ حوادث بھی۔ بیرونی قوتوں کے خطرات سے حفاظت کے لئے اس نے مملکت کی سرحدوں کو عسکری قوتوں کے ذریعے مضبوط رکھنے کی تاکید کی ہے (۸/۶۰)۔ جہاں تک داخلی خرابیوں کا تعلق ہے اس نے کہا ہے کہ اسلامی نظام میں کیفیت یہ ہوگی کہ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا۔ (۲۰/۱۱۲) کسی شخص کو نہ کسی ظالم کے ظلم کا خوف ہوگا نہ سلب و نہب اور غصب و استحصال کا خطرہ۔ دوسری جگہ ہے فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا۔ (۷۲/۱۳) اس میں کسی شخص کو نہ اس کا خوف ہوگا کہ

اس کے حقوق میں کسی قسم کی کمی کی جائے گی، اور نہ ہی اس کا خطرہ کہ کوئی اسے بے عزت اور ذلیل کر سکے گا۔ اسلامی مملکت (کہ جسے قرآن نے استخلاف فی الارض کہہ کر پکارا ہے) کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں "خوف، بدل بہ امن ہو جائے گا۔" (۲۴/۵۵) اس نے کہا ہے کہ اسلامی مملکت (استخلاف فی الارض) "ایمان و اعمالِ صالح" کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں خوف و حزن بار ہی نہیں پا سکتے۔ اس نے بتایا ہے کہ خدا کے پیغمبر یہی بشارت دینے کے لئے آتے تھے کہ جو لوگ "ایمان و اعمالِ صالح" کی راہ اختیار کریں گے۔ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۶/۴۸) انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ نہ کوئی خارجی یا داخلی خطرہ، نہ عدمِ تحفظ کے احساس سے دل گرفتگی اور افسردہ خاطری۔ اس حقیقت کو اس نے بار بار دہرایا ہے۔ دیکھئے۔ (۲/۱۱۲؛ ۲/۲۶۲؛ ۲/۲۷۷؛ ۵/۶۹؛ ۴۶/۱۳) سورہ حٰم میں ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا جن لوگوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ ان کی ربوبیت کا ذمہ دار خدا (کا نظام) ہے۔ اور پھر وہ اپنے اس ایمان و ایقان پر استقامت سے جمے رہے۔ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ۔ ان پر ملائکہ کا نزول ہوگا، جو ان سے کہیں گے اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا۔ تمہیں نہ کسی قسم کا خطرہ لاحق ہوگا نہ حزن۔ وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ (۴۱/۳۰) اور اس طرح وہ انہیں اس جنت کی خوش خبری دیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ (نیز ۴۶/۱۳) یہ نوید جانفزا ملائکہ کی طرف سے ہوگی، اور خود خدا کی طرف سے یہ نشید سکون افزا ان کے لئے وجہ فردوسِ گوش بنے گی کہ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ۔ (۴۳/۶۸)۔ اے میرے بندو! وہ دور آ گیا جس میں تمہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ اس سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنے والوں کو اس نے "اپنا دوست" کہہ کر پکارا ہے اور کہا ہے کہ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (۱۰/۶۲)۔ اے دنیا والو! بگوش ہوش سن رکھو کہ یہ ہیں ہمارے دوست جن کی نشانی یہ ہے کہ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہے نہ حزن۔ یہ ہر قسم کے خطرات سے بھی مامون ہیں اور عدمِ تحفظ (INSECURITY) کے احساس سے بھی مصون۔ ان سے کہا جائے گا کہ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ۔ (۷/۴۹)، تم اس جنت میں داخل ہو جاؤ جس میں تمہیں نہ کوئی خوف ہوگا نہ حزن۔ اس جنت میں داخل ہونے والے جب اس قسم کے اطمینان و سکون کی کیفیت سے سرشار ہوں گے تو بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ۔ (۳۵/۳۴) کس قدر سزاوارِ حمدیت ہے وہ ذات جس نے ہمارا حزن دور کر دیا۔ واضح رہے کہ جہاں تک اخروی زندگی کی جنت (اور جہنم) کا تعلق ہے اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن قرآن کریم میں غور و فکر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جنت اور جہنم کا یہ سلسلہ اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس دنیا کی جنت اس اسلامی نظام کی زندگی ہے جو قوانینِ خداوندی کی رو سے قائم ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا ہے۔ اسلامی نظام (یا مملکت) کے قیام کے لئے السابقون الاولون کے حصے میں مصائب و تکالیف ہی آتی ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے اکثر اس مقصد کے لئے اپنی جان تک دے دیتے ہیں۔ اسلامی مملکت ان کی زندگی میں متشکل نہیں ہو پاتی۔ اس لئے (اس زندگی میں) اس کی برکات و سعادات ان کے حصے میں نہیں آتیں۔ اس سے وہ لوگ بہرہ یاب ہوتے ہیں جو ان کے بعد آتے ہیں۔ لیکن ان کے لئے یہ احساس ان کی قربانیوں کا حسین ترین بدلہ بن جاتا ہے کہ انہیں اگر حیاتِ اخروی میں جنت کی زندگی نصیب ہوتی ہے تو ان کے رفقاء اسی دنیا میں اس سے بہرہ یاب ہو گئے ہیں۔ فرمایا۔ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ — ان

جان دینے والوں کو خدا جو کچھ اپنے فضل و کرم سے عطا کرتا ہے، وہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (۳/۱۶۹) اور اس احساس سے کہ ان کی قربانیوں سے ان لوگوں کے لئے جو ابھی دنیا میں ہیں، ایسا معاشرہ قائم ہو گیا ہے جس میں انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہے نہ حزن، ان کی خوشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ السابقون الاولون کو جنت کی زندگی اگلی دنیا میں جا کر ملتی ہے، لیکن ان کے دیگر رفقا کو وہ زندگی اسلامی معاشرہ کی شکل میں اسی دنیا میں مل جاتی ہے۔

ہم نے شروع میں کہا تھا کہ اسلامی مملکت کی خصوصیات و منفردات کثیر التعداد ہیں، لیکن ان میں سرِفہرست یہ خصوصیتِ کبریٰ ہے کہ اس مملکت میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف لاحق ہوتا ہے، نہ حزن۔ نہ کوئی خطرہ ان کے لئے وجہِ پریشانی ہوتا ہے اور نہ ہی عدمِ تحفظ کا احساس سوہانِ روح۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ اسلامی مملکت، نہ محض کسی آئین کے منظور کر دینے سے وجود میں آجاتی ہے، نہ خاص قسم کے قوانین منضبط یا نافذ کر دینے سے۔ وہ مملکت اس وقت وجود میں آتی ہے جب معاشرہ میں ایسی فضا اور کیفیت پیدا ہو جائے کہ کوئی شخص نہ کسی قسم کا خطرہ محسوس کرے اور نہ ہی اُسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہے کہ معلوم کل کو میرے ساتھ کیا ہو جائے۔ عدمِ تحفظ (INSECURITY) کا احساس، جہنم کی زندگی ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ (۱۴/۱۷) انسان کو ہر طرف سے موت آتے دکھائی دیتی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس میں انسان مر بھی تو نہیں سکتا۔ اس کے برعکس، اسلامی مملکت میں، قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (۵۶/۲۶) ہر سمت سے یہ صدائے حیات بخش وجہ نشاط روح بنتی ہے کہ تم کوئی خدشہ محسوس نہ کرو۔ تم خود بھی محفوظ، تمہارا سب کچھ بھی محفوظ۔

سَلٰمًا سَلٰمًا "کا ذکر آگیا تو ضمناً اتنی وضاحت ضروری ہے کہ ہمارے ہاں "سلامتی" سے مراد خطرات سے حفاظت ہی ہوتی ہے لیکن عربی زبان (اور قرآنی استعمال) کے اعتبار سے، اس کا مفہوم اس سے بڑھ کر ہے۔ "خطرات سے حفاظت ایک سلبی (NEGATIVE) خصوصیت ہے لیکن "سلام" میں ایک ایجابی (POSITIVE) پہلو بھی ہے۔ اس سے مراد ہے کسی کی تکمیل کر دینا"۔ اس سے ظاہر ہے کہ "سلام" میں خطرات سے تحفظ قدمِ اوّل ہے، منزلِ آخر نہیں۔ حفاظت کے بعد اگلا قدم "کسی کی کمی پوری کر کے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ اسی اعتبار سے خدا کی صفت "المؤمن" کے ساتھ دوسری صفت "السلام" بھی آتی ہے۔ "المؤمن" کے معنی ہیں امن کی ضمانت دینے والا" اور "السلام" سے مراد ہے تکمیل تک پہنچانے والا۔ سورۂ مائدہ میں ہے کہ خدا "سبل السلام" کی طرف راہنمائی کرتا ہے (۵:۱۶)۔ اور سورۂ یونس میں کہا گیا ہے کہ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْاۤ اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (۱۰/۲۵)۔ خدا سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یہ "دار السلام" کیا ہے؟ اس دنیا میں وہ نظام جو الاسلام کے مطابق قائم ہوتا ہے۔ اس نظام یا مملکت کے سربراہ سے تاکیداً کہا گیا کہ وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ (۶/۵۴) جب وہ لوگ تیرے پاس آئیں جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، تو ان سے کہو کہ تمہیں ہر طرح کی سلامتی حاصل ہے۔ اس سے مراد صرف ان الفاظ کا زبان سے دہرا دینا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سربراہِ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کو اس امر کی ضمانت دے کہ وہ نہ صرف خارجی خطرات سے محفوظ ہوں گے بلکہ انہیں وہ تمام اسباب و ذرائع بھی میسر ہوں گے جن سے ان کی ذات کی تکمیل ہو جائے۔ یہ جو ہمارے ہاں رواج ہے کہ جب دو مسلمان ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک کہتا ہے "السلام علیکم"

اور دوسرا اس کے جواب میں کہتا ہے "وعلیکم السلام" تو یہ محض "آدابِ معاشرت" کی بات نہیں۔ یہ ایک عظیم بنیادی حقیقت کی علامت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ہر دو افراد (معاشرہ) ایک دوسرے کو اس امر کی ضمانت دیتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں دوسرے کا سب کچھ محفوظ سمجھا ہے اور وہ اس امر کی کوشش بھی کریں گے کہ ایک دوسرے کی تکمیل ذات کا باعث بنیں ۔۔ وَ تَحِیَّتُھُمْ فِیْھَا سَلٰمٌ (۱۰/۱۰) یہی وہ حیات بخش اور جاں نواز تحفہ ہے جو اس معاشرہ میں ایک دوسرے کو پیش کیا جاتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف لاحق ہو سکتا ہے، نہ حزن۔ اور ہر ایک کو سامانِ پرورش اور اسبابِ نشو و نما میسر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز خارج سے عاید کردہ قانونی پابندیوں سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسے تو دل کی گہرائیوں سے ابھرنا چاہیئے۔ اس کے لئے ذہنیتوں کا بدلنا ضروری ہوگا۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کے نزدیک اسلامی مملکت وہ ہے جس میں چور کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں اور زانی کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ صرف تعزیرات ہیں جن کا تعلق مجرمین سے ہے۔ ایک شخص جو عمر بھر چوری نہیں کرتا، اسے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے یا اسے قید کی سزا دی جاتی ہے۔ تعزیرات تو قانون شکن ذہنیتوں کے نقصان رساں اقدامات سے معاشرہ کو محفوظ رکھنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ ان سے محفوظ رہنے کا لازمی نتیجہ یہ نہیں کہ افرادِ معاشرہ کو ہر قسم کے خوف و حزن سے تحفظ کی ضمانت مل جاتی ہے۔ خوف و حزن کے تو سینکڑوں اسباب ہیں، اور ان میں بیشتر ایسے جو نہ صرف یہ کہ وہ کسی قانون کی زد میں نہیں آتے بلکہ ان کا کوئی نام تک بھی نہیں رکھا جا سکتا ۔۔۔ ان جانے غم جن کا کوئی سبب نہیں بتایا جا سکتا۔ بے نشان زخم جو کسی کو دکھائے نہیں جا سکتے۔ بے نام الم جن کا شکوہ تک نہیں کیا جا سکتا، ایک مسلسل گھٹن جس کا سبب معلوم نہیں۔ ایک مبہم دھڑکا جس کی وجہ کا علم نہیں، ایک غیر محسوس شکنجہ جس میں انسان کی روح جکڑی رہتی ہے۔ ایک غیر مرئی پنجہ جو ہر آرزو کا گلا گھونٹ رہا ہوتا ہے ۔۔ یہ ہے جسے حزن کہا جاتا ہے۔ اسلامی مملکت ایسی فضا پیدا کرتی ہے جس میں خوف و حزن کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسی کا نام دارالسلام ہے۔ یہی الاسلام کے شجرِ طیب کا ثمرِ بہشت ہے۔ اسی کو آزادی کہا جاتا ہے۔

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است !

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں ۔۔ ہر اتوار ۔ صبح ۸ بجے
بمقام ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور
ٹیلیفون ۔ ۸۰۸۰۰

ملتان میں ۔۔ ہر جمعہ ۔ بعد از نمازِ جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
بمقام ۔ دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ ملتان
ٹیلیفون ۔ ۲۰۷۱

سیالکوٹ میں ۔۔ ہر اتوار ۔ صبح ۱۰ بجے
(بذریعہ ٹیپ)
بمقام ۔ چوہدری محمد دین ٹی سٹال ۔ کرسچین ٹاؤن
بارہ پتھر ۔ سیالکوٹ (۲)

کراچی میں ۔۔ ہر اتوار ۔ صبح ۹½ بجے (بذریعہ ٹیپ)
بمقام ۔ دفتر بزمِ طلوعِ اسلام ۔ ۱۳ فردوس مارکیٹ
(بالمقابل بس سٹاپ) پہلی چورنگی ۔ ناظم آباد ۔ کراچی ۱۸
ٹیلیفون ۔ ۶۱۴۶۸

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

پیوستہ فہرست مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت نومبر ۷۲ء حسبِ ذیل عطیات بشکریہ موصول ہوئے۔

فہرست "ب"

۱۔ محترم سید امیر حسین صاحب۔ نمائندہ بزم سید حسین۔ جہلم	۵۰۰/-
۲۔ " بشیر احمد صاحب۔ ملکوال	۱۰/-
۳۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور	۵/-
۴۔ بذریعہ نمائندہ بزم طلوعِ اسلام۔ کراچی۔	۵۵/-
۵۔ محترم ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور	۵/-
۶۔ بزم طلوعِ اسلام۔ مردان	۲۰۰/-
۷۔ محترم بشیر احمد صاحب۔ ملکوال	۱۰/-
۸۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور	۵/-
۹۔ " محمد زمان صاحب۔ کلر کہار	۲۰۰/-
۱۰۔ " منشی غلام محمد صاحب۔ کرک	۲۰/-
۱۱۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور	۵/-
۱۲۔ " محمد عالم چوہان صاحب۔ دولا فقر	۵۰/-
۱۳۔ " بشیر احمد صاحب۔ ملکوال	۱۰/-
۱۴۔ " محمد ارشاد صاحب۔ گلہڑہ گلی۔ راولپنڈی	۵/-
۱۵۔ محترمہ ثریا افضل صاحبہ۔ راولپنڈی	۲۰۱/-
۱۶۔ محترم محمد قاسم صاحب۔ کراچی	۱۰/-
۱۷۔ " عبدالمجید، باعکظہ صاحب۔ کراچی۔	۵/-
۱۸۔ محترم ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور	۵/-
۱۹۔ " عبید اللہ جان میاں صاحب۔ ملکا ڈھیر۔ پشاور	۱۰۰/-
۲۰۔ " بشیر احمد میر صاحب۔ لنڈن۔ (انگلینڈ)	۴۰/-
۲۱۔ " محمد اقبال صاحب۔ علی پور۔ مظفر گڑھ۔	۲۰/-
۲۲۔ " محمد حنیف صاحب۔ لاہور	۶۰/-
۲۳۔ " بشیر احمد صاحب۔ ملکوال	۱۰/-
۲۴۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور	۵/-
۲۵۔ " اے حمید صاحب۔ پی آر ایس (ریٹائرڈ) لاہور	۵۰/-
۲۶۔ " محمد لطیف صاحب۔ گلاسگو (سکاٹ لینڈ)	۲۰/-
۲۷۔ محترمہ ڈاکٹر غلام عائشہ صاحبہ۔ کلر کہار	۵۰/-
۲۸۔ محترم عبدالکریم صاحب۔ کلر کہار	۵۰/-
۲۹۔ " بشیر احمد صاحب۔ ملکوال۔	۱۰/-
۳۰۔ " حکیم محمد رمضان صاحب۔ شورکوٹ	۵/-
۳۱۔ " بشیر احمد صاحب۔ ملکوال	۱۰/-
۳۲۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور	۵/-
۳۳۔ " محمد صدیق صاحب۔ دلیو منڈی	۵۰/-
۳۴۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور	۵/-

نوٹ:-

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس۔آر۔او نمبر ۴۵/(K)/۴۵۴ مطبوعہ گزٹ آف پاکستان۔ پارٹ II مورخہ ۱۳ کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۱۵/D کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔

(سیکرٹری) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) لاہور

نایاب کتابوں کے نئے ایڈیشن

پرویز صاحب کے سلسلہ معارف القرآن کی ابتدائی کتابوں اور ادارہ طلوع اسلام کی کچھ اور کتب کے سابقہ ایڈیشن ختم ہو چکے تھے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کے جدید ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی کے بعد چھپ کے شائع ہو چکے ہیں۔

ابلیس و آدم یہ کتاب دین کے بنیادی تصورات پر مشتمل ہے۔ مثلاً انسان کی پیدائش اور کائنات میں اس کا مقام، قصہ آدم اور نظریہ ارتقاء، ملائکہ، ابلیس، شیطان اور جنات کی حقیقت۔ وحی کی غرض و غایت، مقام نبوت و منصب رسالت جیسے موضوعات کی بصیرت افروز تشریح۔ قیمت:- مجلد گرد پوش۔ پندرہ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

جوئے نور یہ "ابلیس و آدم" کے سلسلے کی دوسری کتاب ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تاریخ اور قرآن کا باہمی تعلق، اقوام سابقہ کی داستانوں کے بیان کا مقصد اور فلسفہ مارکس اور قرآنی نظریہ کا بنیادی فرق کیا ہے۔ ان تفصیلات کے بعد حضرت نوح سے لے کر حضرت شعیبؑ تک کے انبیاء کرام کے تذکار جلیلہ، سابقہ قوموں کی تباہی کے اسباب، عذاب خداوندی، نظریہ قومیت، ہجرت، معاشی نظام کی قرآنی تشریح۔ ایسے اہم موضوعات پر سیر حاصل بحث اور دل نشین پیرایہ بیان۔ قیمت:- مجلد گرد پوش۔ پندرہ روپے۔ (علاوہ محصول ڈاک)

برق طور یہ "ابلیس و آدم" کے سلسلے کی تیسری کتاب ہے۔ یہ مشتمل ہے آویزش صاحب ضرب کلیم حضرت موسیٰؑ، اور فرعون، اور بنی اسرائیل کی داستان عروج و زوال پر۔ اس میں ان کے واقعات ہی درج نہیں بلکہ اس ضمن میں نہایت اہم موضوع بھی سامنے آ گئے ہیں۔ مثلاً عصائے موسیٰؑ۔ ید بیضا۔ ساحرین دربار فرعون کی کرشمہ سازیاں اور ان کی حقیقت۔ سمندر کا پھٹنا اور چشموں کا پھوٹنا۔ من و سلویٰ عطا ہونا۔ حضرت موسیٰؑ کا ایک مرد بزرگ سے ملنا۔ ان تمام مباحث پر بڑی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اور داستان بنی اسرائیل کے سلسلہ میں قوموں کے عروج و زوال کے اہم قوانین بھی سامنے آ گئے ہیں۔ مصنف کی نظر ثانی نے مضامین میں خاصا تنوع پیدا کر دیا ہے۔ کتاب بڑے سائز کے عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ جلد مضبوط اور حسین گرد پوش سے مزین۔ قیمت (فی جلد علاوہ محصول ڈاک و پیکنگ) پندرہ روپے

قرآنی فیصلے زندگی کے بیسیوں مسائل اور معاشرت کے معاملات کے متعلق قرآن کے احکام کیا ہیں اور ہم کیا کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے متعلق قرآن کے فیصلے کا آپ کو علم نہیں۔ ان کے بارے میں سب یک جگہ آپ کو اس کتاب میں مل جائے گا۔ اس کتاب کے حصہ اول کا پہلا ایڈیشن بھی ختم ہو چکا تھا۔ اب اس کا تازہ ایڈیشن شائع کر دیا گیا ہے۔ یہ حصہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے علاوہ عام معاشرتی مسائل اور حرام و حلال کے سے اہم موضوعات پر مشتمل ہے۔

حصہ دوم و سوم اس سے پہلے دوبارہ چھپ چکے ہیں۔

قیمت مکمل سیٹ:- ۱۵/- روپے (بکس بورڈ کی جلد کے ساتھ) فی حصہ ۵/- روپے (علاوہ محصول ڈاک پیکنگ)

ملنے کا پتہ

مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور - ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

آئینِ پاکستان ۱۹۷۳ء

مجلس آئین ساز نے پاکستان کا مستقل آئین ۱۰ راپریل ۱۹۷۳ء کو منظور کر لیا اور ۱۲ راپریل کو اسے صدرِ مملکت کی توثیق حاصل ہو گئی۔ اب یہ شائع ہو کر منظرِ عام پر آ گیا ہے لیکن ہنوز نافذ نہیں ہوا۔ اگر صدرِ مملکت نے اپنے خصوصی اختیارات کے تحت اسے جلد نافذ نہ کر دیا تو آئین کی ایک شق کی رُو سے یہ ۱۴ راگست ۱۹۷۳ء کو از خود نفاذ پذیر ہو جائے گا۔ ہم اس آئین کی جزئیات پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہم نے جو تبصرہ عبوری آئین پر کیا تھا (ملاحظہ ہو طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۷۲ء) کم و بیش اُسی کا اطلاق مستقل آئین پر بھی ہوتا ہے۔ اس کے بجائے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ (اس آئین یا اس آئین کے متعلق نہیں) بلکہ خود نفسِ آئینِ پاکستان کے متعلق چند ایک اصولی گوشے سامنے لائے جائیں، جن سے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہاں آئین سازی کے سلسلہ میں اس قدر دشواریاں کیوں پیش آتی ہیں، اور ان دشواریوں کا حقیقی حل کیا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے مملکتِ پاکستان میں گذشتہ پچیس سال میں اول تو کوئی قابلِ اطمینان آئین مرتب ہی نہیں ہو سکا اور جو آئین مرتب ہوا وہ قابلِ عمل ثابت نہ ہوا۔ ایسا کیوں ہوتا رہا؟ اس کے متعلق مختلف توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ:

(۱) بعض خود غرض افراد کی مفاد پرستیاں اور مصلحت کوشیاں اس کی ذمہ دار تھیں۔

(۲) سیاسی پارٹیوں نے اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے ایسے حالات پیدا کر دیئے جن سے آئین سازی کا مسئلہ (دلِ حسرتِ غالب کی طرح) طلسمِ پیچ و تاب بن کر رہ گیا۔ اور

(۳) بعض حلقوں کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں بعض بیرونی طاقتوں کے اشارۂ چشم و ابرو کا بھی دخل رہا۔

یہ توجیہات ممکن ہے اپنی جگہ درست ہوں لیکن ہمارے نزدیک ان میں سے کوئی بھی اس الجھن کا بنیادی سبب نہیں تھی۔ اس کا بنیادی سبب کچھ اور تھا (اور ہے) جس کی وجہ سے نہ سابقہ دساتیر کامیاب ہو سکے اور نہ ہی موجودہ آئین کے متعلق یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ بغیر کسی رکاوٹ کے نسیمِ سحری کی طرح رواں دواں، جادہ پیما ہو سکے گا۔

اس ساری الجھن کا بنیادی اور حقیقی سبب یہ ہے کہ آئین سازی کے سلسلے میں متضاد عناصر کو یکجا رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جب وہ عناصر ایک دوسرے کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتے تو بجائے اس کے کہ ٹھنڈے دل سے سوچا جائے کہ ان میں کیا کیا تضادات ہیں اور انہیں کیسے رفع کیا جا سکتا ہے عافیت اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ ان متضاد عناصر کا مفہوم متعین اور واضح نہ کیا جائے ——— انہیں مبہم چھوڑ دیا جائے ——— اس طرح آئین سازی کے سلسلے میں نزاع اور اختلاف وقتی طور پر ختم ہو جاتا ہے (یا یوں کہئے کہ دب جاتا ہے) لیکن جب اس کے عملی نفاذ کا وقت آتا ہے تو یہ تضادات ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔

اور وہی افراد یا پارٹیاں جنہوں نے متفقہ طور پر آئین کی ترتیب یا تصویب کی تھی باہم گر، دست و گریباں ہونے لگ جاتی ہیں اور ملک میں خلفشار پیدا ہو جاتا ہے جو اس آئین کی تنسیخ یا تعطل پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب پھر آئین سازی کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو جمع بین النقیضین کا وہی عمل پھر دہرایا جاتا ہے اور متضاد عناصر کو پھر اسی طرح مبہم چھوڑنے میں عافیت سمجھی جاتی ہے۔ نتیجہ اس کا پھر وہی ہوتا ہے۔ جب تک آپ اس معیشت تکرار، کو چھوڑ کر (جس کی بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہے) حقائق کا سامنا نہیں کریں گے۔ اس مملکت کے لئے کوئی قابلِ اطمینان ممکن العمل آئین مرتب نہیں ہو سکے گا۔ اس تمہید کے بعد آئیے اس اجمال کی تفصیل کی طرف۔

(۱) اس مملکت کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اور مقصد اس سے یہ تھا کہ اس میں اسلامی نظام رائج کیا جائے۔

اسلام کیا ہے؟

اس پچیس سال کے عرصے میں کسی برسرِ اقتدار پارٹی یا آئین ساز مجلس نے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا۔ لیکن اس اقرار و اتفاق کے باوجود آج تک یہ طے ہی نہیں کیا گیا کہ اسلام کہتے کسے ہیں اور اسلامی نظام سے مفہوم کیا ہے۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیاں اور مذہبی فرقے تو ایک طرف ہر فرد کے ذہن میں اسلام کا تصور الگ الگ ہے۔ جب تک اسلام کی حیثیت ایک مذہب کی سی رہے، ہر فرقہ اور فرد اس خود فریبی میں مگن رہتا ہے کہ اسکے تصور کا اسلام صحیح اسلام ہے اور دوسرے فرقوں اور افراد کا تصور باطل۔ اب رہا یہ کہ اس کا ثبوت کیا ہے تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس کا فیصلہ قیامت میں جا کر ہو گا۔ لیکن جب اسلام نے ایک مملکت کی اساس اور اُس کے نظام کی بنیاد قرار پانا ہو تو پھر اس خود فریبی سے کام نہیں چل سکتا۔ اس کے لئے آپ کو طے کرنا ہو گا کہ اسلام کا متعین مفہوم کیا ہے اور اس کے نظام کی شکل کیا ہو گی۔ لیکن اس پچیس برس میں اس قسم کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ مذہبی پیشوائیت کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اسلام کا متفق علیہ مفہوم متعین کرنا اُن کے بس کی بات نہیں۔ جو لوگ ہزار سال میں نماز کی کوئی متفق علیہ شکل متعین نہ کر سکے ہوں، وہ اسلام یا اسلامی نظام کا متفق علیہ مفہوم کس طرح متعین کر سکتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی ہے کہ اس پر پردہ ہی پڑا رہے تو اچھا ہے۔ اربابِ اقتدار نے بھی اسی میں مصلحت دیکھی کہ بھڑوں کے اس چھتے کو نہ چھیڑا جائے۔ اس کی بڑی دلچسپ توجیہہ منیر انکوائری کمیٹی کے ججوں نے پیش کی تھی۔ انہوں نے حضرات علمائے کرام سے کہا تھا کہ وہ بتائیں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ جن علماء نے اس سوال کا جواب دیا، اُن میں سے کسی کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ یہ ماجرا بیان کرنے کے بعد اُن ججوں نے لکھا تھا کہ ہم بھی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اپنی طرف سے کوئی جواب نہ دیں۔ اس لئے کہ اگر وہ جواب کسی ایک عالم کے جواب کے مطابق ہو گا۔ تو ہم پر باقی علماء کفر کا فتوے لگا دیں گے اور اگر وہ کسی سے بھی متفق نہیں ہو گا تو ہمارے خلاف متفقہ کفر کا فتوےٰ لگ جائے گا۔ یہی تھی وہ عافیت کوشی اور مصلحت بینی جس کے ماتحت نہ مولوی صاحبان نے اسلام کا متعین مفہوم پیش کرنے کی کوشش کی، نہ اربابِ اقتدار نے ایسا خطرناک قدم اٹھایا۔ حالانکہ دیانت کا تقاضا تھا کہ جب اس امر کا اقرار کیا جاتا تھا کہ ہمارے آئین کی بنیاد اسلام ہو گی تو اسلام کا مفہوم متعین کیا جاتا، اور اگر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا تو پھر جرأت سے اعلان کیا جاتا کہ ایسا آئین مرتب کرنا یا مملکت میں اسلامی نظام رائج کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ یہ "کفر" ہی سہی، لیکن یہ کفر اُس "منافقت" سے بہرحال بہتر ہو گا جس کی رُو سے زبان سے اسلام اسلام پکارا جاتا ہے اور دل میں ہر شخص سمجھتا ہے کہ ـــــ یہ ہے وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا۔

ریاست کا مذہب

(۲) اس سے پہلے اسلام کو مملکت کی اساس قرار دیا جاتا تھا لیکن موجودہ آئین میں ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا ہے اور کہا گیا ہے۔

ISLAM SHALL BE THE STATE RELIGION OF PAKISTAN.

یعنی مملکتِ پاکستان کا مذہب اسلام ہوگا۔

آپ (سابقہ) مجلسِ آئین ساز سے متعلقہ حضرات یا مولوی صاحبان میں سے کسی سے پوچھیں کہ اس جدید اصطلاح کا مطلب کیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ کس طرح بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔

آپ سوچئے کہ جس آئین سازی کے نقطۂ آغاز یا اساس و بنیاد کی یہ کیفیت ہو، اس پر عمارت کیا اُٹھے گی؟

نظریۂ پاکستان

(۳) ہم پچیس برس سے یہ سنتے چلے آ رہے ہیں کہ مملکتِ پاکستان کی بنیاد نظریۂ پاکستان پر ہے۔ زیرِ نظر آئین میں جو حلف نامہ دیا گیا ہے اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اعلیٰ مناصب پر فائز اربابِ اقتدار اس امر کی قسم اٹھائیں گے کہ وہ اسلامک آئیڈیالوجی یعنی نظریۂ پاکستان کا تحفظ کریں گے۔ اس سے بھی اس نظریہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود آج تک نہیں بتایا گیا کہ نظریۂ پاکستان کا مفہوم کیا ہے۔ آئین میں ایک الگ باب "تعبیرات" کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ نظریۂ پاکستان کے متعلق اُس میں بھی کچھ نہیں کہا گیا۔

دو قومی نظریہ

(۴) مملکتِ پاکستان کا دوسرا ستون دو قومی نظریہ ہے۔ مختصر الفاظ میں اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مملکت میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ اس پچیس سال میں ..... کوئی برسرِ اقتدار پارٹی ایسی نہیں آئی جس نے یہ کہا ہو کہ پاکستان کے غیر مسلم 'پاکستانی قوم' کے افراد نہیں ہو سکتے۔ یہاں ہر آئین میں مملکتِ پاکستان میں بسنے والے تمام باشندوں کو بلا امتیازِ مذہب ایک قوم قرار دیا گیا ہے۔ زیرِ نظر آئین میں صرف صدرِ مملکت اور وزیرِ اعظم کے متعلق یہ شرط عاید کی گئی ہے کہ وہ اپنے مسلمان ہونے کا حلف لیں گے۔ اس کے علاوہ مسلم اور غیر مسلم میں کسی قسم کی کوئی تمیز نہیں کی گئی۔ واقعاتی پوزیشن تو یہ ہے لیکن اس کے باوجود نعرہ یہی بلند کیا جاتا ہے کہ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر ہے۔ نہ کوئی بتاتا ہے نہ کوئی پوچھتا کہ وہ دو قومیں کون سی ہیں جو پاکستان میں آباد ہیں؟

کتاب و سنت

(۵) سابقہ دساتیر کی طرح اس دستور میں بھی یہ شق رکھی گئی ہے کہ مملکت کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا۔ یہ شق بڑی اہم ہے۔ اور اگر بغور دیکھا جائے تو یہی شق وہ ہے جو سیکولر حکومت اور اسلامی حکومت میں خطِ امتیاز کھینچتی ہے۔ ہم پہلے دن سے مسلسل پکارتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ شق ناممکن العمل ہے۔ اس شق میں "کتاب" سے مراد قرآن مجید ہے جس کے (کم از کم) متن پر تمام مسلمان متفق ہیں۔ لیکن جہاں تک سنت کا تعلق ہے دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس کے مندرجات کو تمام مسلمان متفقہ طور پر سنت تسلیم کرتے ہوں۔ ایسی کتاب کا وجود تو ایک طرف، مختلف فرقوں کے مسلمان "سنت" کی تعریف (DEFINITION) پر بھی متفق نہیں۔ "سنت" ہر فرقے کی الگ الگ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حالات میں قرآن و سنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ طلوعِ اسلام اس حقیقت کو سامنے لایا، تو

مولوی صاحبان کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ طلوعِ اسلام کو منکرِ سنت قرار دے دیا جائے اور پرویز صاحب پر کفر کے فتوے لگا دیئے جائیں۔ لیکن اس سے یہ مسئلہ حل تو نہیں ہو سکتا تھا۔ قریب بیس سال کی کشمکش کے بعد بالآخر جماعتِ اسلامی کے بانی ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کو (جو طلوعِ اسلام کو منکرِ سنت قرار دینے کے جہاد میں پیش پیش رہتے) اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی رو سے فی الواقعہ کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ (ملاحظہ ہو ہفت روزہ ایشیا۔ بابت ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)۔ مودودی صاحب کے اس اعلان کی کسی مولوی نے بھی تردید نہیں کی جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سب اس باب میں ان سے متفق ہیں۔ لیکن طرفہ تماشہ یہ کہ اس کے باوجود جماعتِ اسلامی اور دوسری مذہبی جماعتوں کی طرف سے بدستور یہ مطالبہ کیا جاتا رہا کہ آئین میں یہ شق رکھی جائے کہ مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ مجلسِ آئین ساز نے بھی (سابقہ مجالس کی طرح) اسی میں عافیت سمجھی کہ چپکے سے یہ شق آئین میں رکھ دی جائے۔ اس طرح یہ حضرات مطمئن ہو گئے کہ — رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت — اور مذہب کے اجارہ دار خوش ہو گئے کہ ملک میں اسلام کے نام پر فساد برپا کرنے کی گنجائش بہرحال موجود رہی۔ چنانچہ ہوگا یہ کہ جب کتاب و سنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا تو یہ حضرات شور مچا دیں گے کہ دیکھئے! حکومت اس سے جان بوجھ کر اعراض برت رہی ہے۔ یہ لوگ یہی کہہ کر سابقہ حکومتوں کے خلاف ہنگامے برپا کرتے رہے ہیں۔ اب بھی یہ یہی کچھ کریں گے۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ

کارِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

آپ ان حقائق کو سامنے رکھئے اور سوچئے کہ اگر قوم اسلام کے معاملے میں (SERIOUS) ہو تو کیا وہ اس قدر اہم بنیادی تقاضوں کو اس طرح مبہم رکھ کر مطمئن ہو جائے گی کہ ہم نے اسلامی آئین مرتب کر دیا ہے۔ "مغرب زدہ" طبقہ کو تو چھوڑیئے۔ ہم مذہب کے اجارہ داروں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ بتائیں کہ کیا اس طرح کی عافیت کوشی سے یہاں اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ ایسی ہی تھی وہ صورتِ حالات جس سے متاثر ہو کر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

(۱)

جمہوریت اور اسلام

یہاں تک بات ابہامات کی ہو رہی تھی۔ اب تضادات کی طرف آیئے۔ (سابقہ دساتیر کی طرح) زیرِ نظر دستور کی بھی یہ خصوصیت بتائی جاتی ہے کہ یہ "اسلامی جمہوری وفاقی" ہے۔ "وفاقی" کی بات تو ہم بعد میں کریں گے، سردست یہ دیکھئے کہ "جمہوری" اور "اسلامی" کس قدر متضاد عناصر ہیں جنہیں یکجا کیا جاتا ہے۔ جمہوریت (DEMOCRACY) دورِ حاضر کی ایک معروف سیاسی اصطلاح ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ:

(۱) اقتدارِ مطلق عوام کو حاصل ہوتا ہے جسے وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے روبہ عمل لاتے ہیں۔

(۲) جب منتخب نمائندے پارلیمان میں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو اکثریتی پارٹی حکومت قائم کرتی ہے اور اقلیتی

یورپ کا واویلا

کی شامت اس قدر بڑھ گئی کہ اس کی چیخ و پکار نے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد رابرٹ بریفو نے لکھا تھا کہ :-

یہ جنگ مع اپنے تمام بہیمانہ مظاہروں کے جن کی وجہ سے آج ہمارا شعور گوناگوں وحشت انگیزیوں کا مسکن بن رہا ہے، کوئی ہنگامی واقعہ یا اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ یہ تمام مجرمانہ حماقتیں، تمام منافقتیں، تہمت تراشیاں اور دروغ بافیاں، یہ تمام سنگدلانہ حرکات، انسانی زندگی اور قوت اور دولت کی یہ تمام بربادی اور دہشت انگیز تباہی۔ غرضیکہ یہ پورے کا پورا پاگل پن اور اس کا ایک ایک عنصر، ہماری قبل از جنگ کی مغربی تہذیب کے اندر موجود تھا۔ جنگ دراصل ان تمام مذموم افعال اور نفرت انگیز اعمال کا مرئی اور بالمحسوس مظاہرہ تھا جن کی مسموم فضا میں ہم گھرے ہوئے تھے۔ جنگ نے صرف اتنا ہی کیا کہ ان بھیانک چہروں سے نقاب الٹ دیا۔

(THE MAKING OF HUMANITY)

اسی دور کے ایک ماہر تجزیہ نفس، ڈاکٹر ولہیم سٹیکل نے لکھا تھا :-

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جرائم عام ہو چکے ہیں۔ چوری ایک مہذب ہنر بن چکی ہے، صرف اس کا نام بدل دیا گیا ہے۔ اب اسے کاروبار (بزنس) کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ قتل ایک عام بات ہو چکی ہے۔ سرمایہ شہنشاہِ مطلق ہے۔ جنگ سے سہل انگاری عام ہو چکی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ کسی طرح مفت میں دولت ہاتھ آ جائے اور کام نہ کرنا پڑے۔ اخلاق کا معیار بہت پست ہو گیا ہے۔ معاشرہ کی شرم کا اب احساس تک نہیں رہا۔ اب شرم صرف اسے آتی ہے جو دوسروں کا خون چوسنے میں ناکام رہ جاتا ہے۔ جنگ کے بعد قماربازی کا چسکا عام ہو گیا ہے حتیٰ کہ اب وہ جنون کی کیفیت* اختیار کر چکا ہے۔ جوئے کی سینکڑوں مہذب قسمیں ایجاد ہو چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شراب خوری۔ اس سے بوڑھے، بچے سب کی قوتِ عمل تباہ ہو جاتی ہے۔ اور لوٹ مار، اور تباہ کاری کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔

(PECULIARITIES OF BEHAVIOUR)

آپ خود سوچئے کہ اگر میں یہ نہ بتاتا کہ اس میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد اقوامِ مغرب کا نقشہ کھینچا گیا ہے، تو آپ یہی سمجھتے کہ یہ خود پاکستان کا تذکرہ ہو رہا ہے! بہرحال، اس اخلاقی پستی کا آغاز

---

* اس خطاب میں کئی باتیں ایسی آئیں گی جنہیں میں اس سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں۔ لیکن دنیا کے حالات اس قدر ابتر ہوتے جا رہے ہیں کہ انہیں بار بار دہرانے کی ضرورت ہے۔

پارٹی (یا پارٹیاں) حزبِ مخالف قائم کر لیتی ہیں۔ جمہوری نظام میں ان دو متخالف پارٹیوں کا وجود ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔

(۳) پارلیمان میں اکثریت کا فیصلہ حرفِ آخر ہوتا ہے جس پر کسی کا کنٹرول یا بالادستی نہیں ہوتی۔

یہ ہیں جمہوری نظام کے ممیز اجزائے ترکیبی۔ اب اسلامی نظام کو لیجئے۔ اس نظام میں:-

(۱) اقتدارِ مطلق نہ کسی فرد کو حاصل ہوتا ہے نہ جماعت کو۔ نہ پارلیمان کو نہ اس کی اکثریت کو۔ اقتدارِ مطلق خدا کی کتاب کو حاصل ہوتا ہے اور اسلامی حکومت خدا کی اس کتاب کے اصول و اقدار اور احکام و قوانین کے نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ اس کتاب کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنا کاروبار سرانجام دیتی ہے۔

(۲) مملکت کا یہ کاروبار اُمت کے نمائندوں کے باہمی مشورہ سے طے پاتا ہے۔ اس لئے ان کی پارلیمان میں نہ کوئی حزبِ اقتدار ہوتا ہے، نہ حزبِ مخالف۔ قرآن کی رُو سے امت میں اس طرح کے احزاب کا تصور ہی باطل ہے جو مستقل طور پر ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے ہوں۔ اس کی رُو سے احزاب دو ہی ہیں یعنی حزب اللہ اور حزب الشیطان۔

آپ جمہوریت اور اسلامی نظام کے ان اجزائے ترکیبی کو آمنے سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا کوئی نظام بہ یک وقت جمہوری اور اسلامی ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر اس قسم کے متضاد نظاموں کو یکجا رکھا جائے گا تو اس کا نتیجہ کشمکش باہم اور آویزش مسلسل کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس تضاد میں مفاہمت پیدا کرنے کے لئے حل یہ سوچا گیا کہ آئین میں اس قسم کی شقیں رکھی جائیں کہ مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اور مملکت اپنے اختیارات کا استعمال خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے کرے گی۔ کتاب و سنت

حدود اللہ

کے متعلق ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کا کوئی متفق علیہ مفہوم ہی نہیں۔ جہاں تک حدود اللہ کا تعلق ہے آئین میں اس کی صراحت کبھی کہیں نہیں کی گئی۔ اس مشکل کے حل کے لئے مجلس دستور ساز میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ کوئی اتھارٹی ایسی ہونی چاہیئے جو یہ فیصلہ کرے کہ مملکت ان حدود سے تجاوز تو نہیں کر رہی — کسی نے کہا کہ وہ اتھارٹی مجوزہ اسلامک کونسل ہونی چاہیئے، اور کسی نے سپریم کورٹ کو ایسی اتھارٹی تجویز کیا۔ صدرِ مملکت نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ سوال اس اتھارٹی یا اُس اتھارٹی کا نہیں، اگر ہم اس مقصد کے لئے پارلیمان سے باہر کوئی اتھارٹی بھی تسلیم کر لیں گے تو اس سے پارلیمان کی حاکمیت (SUPREMACY) ختم ہو جائے گی۔ اور ہمارا نظام جمہوری نہیں رہے گا۔ (روزنامہ حُریت کراچی۔ مورخہ ۱۵ر اپریل ۱۹۷۳ء) آپ نے دیکھا کہ دو متضاد عناصر کے یکجا کرنے سے کیا کشمکش پیدا ہوئی۔ جمہوری نظام کا تقاضا ہے کہ حاکمیت پارلیمان کو حاصل ہے اور اسلامی نظام کا تقاضا ہے کہ قولِ فیصل خدا کی مقرر کردہ حدود ہوں۔ اگر ان حدود کو بالادست قرار دیا جائے تو پارلیمان کی حاکمیت باقی نہیں رہتی۔ اور اگر پارلیمان کی حاکمیت کو برقرار رکھا جائے تو آئین کی یہ شق محض تبرک بن کر رہ جاتی ہے۔ اس آئین میں نہ تو ان حدود کی صراحت کی گئی ہے اور نہ ہی کوئی ایسی اتھارٹی مقرر کی گئی جو متنازعہ فیہ امور میں یہ فیصلہ دے کہ ان حدود سے تجاوز کیا گیا ہے یا نہیں۔ مجلس دستور ساز کے

مذہب پرست طبقہ نے بھی اس اتھارٹی کے تعین پر زور دیا۔ یہ نہیں کیا کہ ان حدود کی وضاحت کر دیتے اور کہہ دیتے کہ انہیں آئین کے اندر شامل کر دیا جائے۔ انہوں نے بات اس طرف آنے ہی نہیں دی کہ یہ حدود کیا ہیں۔ اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر یہ بات اٹھائی گئی تو اس کا نتیجہ ان کے باہمی سر پھٹول کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ یہ ذمہ داری کسی اتھارٹی کے سر تھوپ دی جائے۔ اور اکثریتی پارٹی نے ایسی اتھارٹی کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تاکہ جمہوریت کے تقاضے کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔

یہ ہے وہ آئین جس کے متعلق اعلان کیا جاتا ہے کہ یہ جمہوری بھی ہے اور اسلامی بھی۔ اور مذہب پرست طبقہ فخریہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے اسے اسلامی بنوا دیا۔ معلوم نہیں اسے خود فریبی کہا جائے یا خدا فریبی!

وفاقی

۴۔ اب آیئے اس آئین کے وفاقی ہونے کے متعلق۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ پہلے یہ سمجھ لیں کہ وفاقی ہوتا کیا ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ بات یوں ہوئی کہ امریکہ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں تھیں۔ انہوں نے سوچا کہ اگر ہم اسی طرح الگ الگ رہے تو بڑی طاقتیں ہمیں جھپٹ کر لے جائیں گی۔ بہتر یہ ہے کہ ہم سب ایک مشترکہ مرکز قائم کر لیں۔ اس کے لئے انہوں نے باہمی رضامندی سے طے کیا کہ ہم اپنے اختیارات میں سے کون کون سے اختیار مرکز کو دے دیں۔ اس طرح جو سیاسی نظام قائم ہوا اُسے فیڈرل یا وفاقی نظام کہا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ فیڈرل سسٹم وہاں قائم ہوتا ہے جہاں کچھ خود مختار (SOVEREIGN) ریاستیں باہمی رضامندی سے اپنے اختیارات کا کچھ حصہ ایک مرکز کے سپرد کر دیں اور اس طرح 'بطیبِ خویش' خود اس تسبیح کے دانے بن جائیں۔

ظاہر ہے کہ مملکتِ پاکستان کی نہ ایسی حیثیت تھی، نہ اب ہے۔ یہاں ایک واحد آزاد مملکت وجود میں آئی تھی۔ اس مملکت کے وجود میں آنے سے پہلے، انگریزوں نے، اپنی انتظامی سہولت کے لئے اس خطۂ زمین کو چند صوبوں میں بانٹ رکھا تھا۔ یہ صوبے نہ الگ الگ مملکتیں تھیں، نہ آزاد۔ لہٰذا، اس مملکت میں فیڈرل سسٹم کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ دن ہماری تباہی کا یومِ آغاز تھا جب یہاں کسی نے مملکت کے کان میں فیڈرل سسٹم کا افسوں پھونکا۔ اس مبنی بر فریب تصور کی رو سے یہاں کے صوبے مملکتیں تصور کر لئے گئے۔ (یا یوں کہیئے کہ جب یہاں فیڈرل سسٹم کا تصور دیا گیا، تو ان صوبوں نے فرض کر لیا کہ وہ آزاد مملکتیں ہیں)۔ اب ذرا اس تضاد کو دیکھئے کہ مرکز کہتا ہے کہ صوبے فیڈرل سسٹم کے (UNITS) تو ہیں لیکن ان کے اپنے اختیارات کوئی نہیں۔ اختیارات سب مرکز کے ہیں اور مرکز ان میں سے بعض اختیارات اپنی صوابدید کے مطابق ان صوبوں کو تفویض کر دینا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس صوبے کہتے ہیں کہ جب ہم فیڈرل سسٹم کے (UNITS) ہیں تو پھر اختیارات قاطبۃً ہمارے ہیں۔ ہم جو اختیارات چاہیں مرکز کو تفویض کریں۔ یہ ہے وہ بناءِ نزاع جو یہاں مسلسل خلفشار کا موجب بن رہی ہے، اور جو رفتہ رفتہ چار صوبوں کے بعد، چار قومیتوں کے دعویٰ پر منتج ہو رہی ہے۔

(۶)

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ تدوینِ آئین کے سلسلے میں جو کشمکش یہاں گذشتہ پچیس سال سے جاری ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس میں متضاد عناصر کو یکجا رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جب ان میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے تو بجائے اس کے کہ اس ٹکراؤ کا حل سوچا جائے، عافیت اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ آئین کی ان شقوں کو مبہم رہنے دیا

جاتے۔ پھر اقتدار طبقہ سمجھتا ہے کہ بلا ٹل گئی۔ اور مذہب پرست طبقہ (جس میں جماعتِ اسلامی سرفہرست ہے) اندر ہی اندر خوش ہو جاتی ہے کہ ملک میں خلفشار پیدا کرنے کے مواقع بدستور قائم رہے۔

واضح رہے کہ مملکتِ پاکستان کی پوزیشن ساری دنیا سے الگ اور منفرد ہے۔ اس لئے یہاں کا آئین بھی منفرد ہوگا۔ اس کی مثال نہ مغرب کے کسی نظام میں مل سکے گی نہ مروجہ اسلام میں۔ ہمارے آئین کی تدوین کی اطمینان بخش اور قابلِ عمل صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہوگی کہ قرآنِ کریم کی متعین کردہ حدود کو واضح طور پر سامنے رکھ لیا جائے اور ان کے اندر رہتے ہوئے اپنے حالات کے مطابق، آئین کی جزئیات بھی مرتب کر لی جائیں اور قوانین کا ضابطہ بھی۔ اگر پارلیمان میں ایسے اراکین آ گئے (جیسا کہ صدرِ اول کی مجلسِ مشاورت میں ہوتا تھا) جنہیں قرآن پر عبور حاصل ہو تو ان کے مشورہ سے سربراہِ مملکت کا فیصلہ قانونی شکل اختیار کرے گا۔ اگر ایسا نہ ہو (اور موجودہ حالات میں سردست ایسا ممکن نہیں) تو پھر لامحالہ اس کے لئے عدالتِ عالیہ کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوگا۔ وہ اختلافی تعبیر کا فیصلہ کرنے کے لئے ملک کے ان اربابِ بصیرت کے علم و فکر سے مستفید ہوگی جن کی قرآن پر نگاہ ہو۔ ان نزاعات میں اس کا فیصلہ قولِ فیصل قرار پائے گا۔ اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کہ اس سے پارلیمان کی حاکمیت (SUPREMACY) مجروح ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس آئین میں حاکمیت نہ پارلیمان کو حاصل ہوتی ہے نہ عدالتِ عالیہ کو۔ اس میں سوال حدود اللہ کی صراحت اور وضاحت کا ہوتا ہے اور اختلافی مواقع پر ان کی تعبیر کا۔ (وہ بس، یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق ہمارے ہاں صحیح اسلامی آئین (اور ضابطۂ قوانین) مرتب ہو سکے گا۔ ایسا کرنے میں اس کا قطعاً خیال نہ کیا جائے کہ وہ آئین یا ضابطۂ قوانین مغرب کے سیاسی نظام یا مسلمانوں کے مروجہ تصورات کے مطابق ہے یا نہیں۔ مملکتِ پاکستان کو قرآنی تجربہ کی لیبارٹری بنانے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جو تجربہ غیر متبدل حدود و اقدار کے تابع کیا جائے گا، اس کے لئے انسانوں کا وضع کردہ کوئی آئین یا نظام بھی "قابلِ تقلید یا مثال" نہیں بن سکیگا۔

باب دوم

مستقل آئینِ پاکستان

موجودہ مستقل آئین اصولی حیثیت سے کم و بیش وہی ہے جسے عبوری آئین کی شکل میں مجلسِ آئین ساز میں پیش کیا گیا تھا۔ اس میں چند ایک ترمیمات کے بعد اسے مستقل آئین کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ ہم نے عبوری آئین پر جو تبصرہ طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۷۳ء میں شائع کیا تھا، کم و بیش اس کا اطلاق موجودہ آئین پر بھی ہوتا ہے، بنابریں اب ہم صرف ان اہم تبدیلیوں کو سامنے لانے پر اکتفا کریں گے جو عبوری آئین میں کی گئی ہیں۔ واضح رہے کہ طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے، نہ ہی یہ عملی سیاست میں حصہ لیتا ہے۔ اس لئے آئین کے منظور ہو جانے کے بعد اس پر تنقید یا تبصرہ سے ہمارا مقصد ہنگامہ آرائی نہیں ہوتا۔ ہمارا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ

اربابِ فکر و نظر کی خدمت میں عرض کیا جائے کہ ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق اسلامی آئین کے خط و خال کیا ہوتے ہیں تاکہ اگر کوئی صاحب یا جماعت کسی موجودہ آئین میں ترمیم کرنا چاہے یا آئندہ کسی نئے آئین کی تدوین کا موقع آئے، تو ہماری گذارشات اُن کے لئے دلیلِ راہ بن سکیں۔

۱۔ قرار دادِ مقاصد

عبوری آئین میں یہ کہا گیا تھا کہ خدا نے اپنے اختیارات مملکتِ پاکستان کو تفویض کر دیئے ہیں۔ ہم نے اس سلسلہ میں لکھا تھا کہ اس سے خدا کے متعلق باطل تصور پیدا ہوتا ہے۔ مقامِ تشکر ہے کہ مستقل آئین میں ان الفاظ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ہم طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۷۳ء میں وضاحت سے لکھ چکے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کے باطل تصورات کا بنیادی سبب وہ عقیدہ ہے جو ہمارے ہاں صدیوں سے چلا آرہا ہے کہ خدا نے انسان کو "اپنا خلیفہ" بنایا ہے۔ یہ عقیدہ قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ خدا حیّ و قیوم، زندہ و پائندہ، ابدی اور ازلی کائنات کا حاکمِ مطلق ہے۔ اسے نہ کسی کو اپنا خلیفہ (جانشین) بنانے کی ضرورت ہے نہ اپنے اختیارات تفویض کرنے کی حاجت۔ کائنات کی ہر شے اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اُس نے انسانی زندگی کے لئے بھی وحی کی رُو سے کچھ قوانین مقرر کئے ہیں اور انسان سے کہا ہے کہ اگر وہ ان کے مطابق زندگی بسر کرے گا، تو اُس کی دنیا اور آخرت جنت بداماں ہوگی۔ ایسا نہ کرے گا تو وہ جہنم کے عذاب میں مبتلا رہے گا۔ اسلامی نظام کا فریضہ ایسے حالات پیدا کرنا ہے جن میں انسان بطیبِ خاطر قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر سکنے کے قابل ہو سکے۔

۲۔ اسلامی سوشلزم

ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ "اسلامی سوشلزم" بھی "اسلامی جمہوریت" کی طرح جمع بین النقیضین ہے۔ یعنی جس طرح اسلام اور مغربی جمہوریت یکجا نہیں ہو سکتے، اسی طرح اسلام اور سوشلزم بھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ جمہوریت سیاسی نظام میں کسی حدود کی پابند نہیں ہوتی، اور سوشلزم معاشی نظام میں حدود ناآشنا ہوتی ہے۔ ان کے برعکس، اسلام نام ہی حدود اللہ کی پابندی کا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حدود فراموش (اقتدارِ مطلق کا حامل) نظام، اور پابندِ حدود نظام یکجا نہیں رہ سکتے۔ قرآن نے حدود فراموش اور قیود شکن نظام کو ابلیسی نظام کہہ کر پکارا ہے (اور عقیدۂ کرسی کو جس میں انسانوں کی خود ساختہ پابندیوں پر حدود اللہ کا ٹھپہ لگا کر اسے خداوندی اختیارات "قرار دیا جاتا ہے، شرک سے تعبیر کیا ہے)۔ بنا بریں "اسلامی سوشلزم" دو متضاد عناصر کے مجموعہ کا نام ہے۔ غنیمت ہے کہ مستقل آئین میں اسلامی سوشلزم کی اصطلاح شامل نہیں کی گئی۔ ہمارا مذہب پرست طبقہ بغلیں بجا رہا ہے کہ یہ اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ حالانکہ ان کا جذبۂ محرکہ یہ ہے کہ وہ اُس سرمایہ دارانہ نظام کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جو ہمارے دورِ ملوکیت کی یادگار ہے اور جسے غیر اسلامی سازشوں نے عین اسلام بنا کر ہمارے ہاں رائج کر رکھا ہے۔ ان کے برعکس طلوعِ اسلام اس لئے مطمئن ہے کہ اگر کسی کی سمجھ میں بات آگئی اور اُس کے دل میں تڑپ پیدا ہوگئی تو اس ملک میں قرآن کے معاشی نظام کے رائج کرنے کا امکان باقی رہے گا۔ آئین میں اس اصطلاح کے بجائے کہا یہ گیا ہے کہ

> مملکت ہر قسم کے استحصال کو ختم کرنے کا انتظام کرے گی۔ اور اس بنیادی اصول پر بتدریج عمل کرے گی کہ ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے۔ اور ہر ایک کو اس کے

کام کے مطابق معاوضہ دیا جائے

اس وقت دنیا کی مختلف سوشلسٹ مملکتیں اسی اصول پر عمل کر رہی ہیں اور یا تو واقعی اس فریب میں مبتلا ہیں یا جان بوجھ کر دنیا کو اس فریب میں مبتلا رکھنا چاہتی ہیں کہ اس سے انہوں نے نظامِ سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا ہے۔ حالانکہ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ اصول نظامِ سرمایہ داری سے بھی بدتر ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کام کرنے والے (عامل یا کاسب) کی حیثیت "مزدور" کی قرار دی جاتی ہے۔ یعنی وہ شخص جو اپنے کام کے بدلے میں (مزد) یعنی (WAGES) کا حق دار ہے۔ یہ "مزد" کس معیار کے مطابق مقرر کی جائے گی؛ اس کا اختیار کام کرانے والوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور کام کرنے والا اُن کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلسٹ نظام میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں میں کاسب کو اُس کے کام کی مُزد دی جاتی ہے جس کا تعین کام کرانے والوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

جہاں تک اس اصول کے دوسرے حصے کا تعلق ہے — یعنی ہر ایک سے اُس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے۔ اس باب میں سوشلسٹ نظام، نظامِ سرمایہ داری سے بھی بدتر ثابت ہوتا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں کام کرنے والوں کو اس کا تو اختیار ہوتا ہے کہ وہ جی چاہے تو اُس مُزد پر کام کریں اور جی چاہے تو اس سے انکار کر دیں لیکن سوشلسٹ نظام میں کام کرنے والوں کے لئے یہ اختیار بھی نہیں رہتا۔ وہ اُس مُزد پر کام کرنے سے انکار کر ہی نہیں سکتے۔ غالبؔ نے شاید ایسے ہی مقام کے لئے کہا تھا کہ

ہم نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹیں
وہ ستمگر میرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا!

انسانیت ساز نظام قرآن ہی کا ہے جس میں کام کرنے والے کو اُس کے کام کی مُزد نہیں ملتی بلکہ نظامِ مملکت اُس کی تمام ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل آپ کو پرویز صاحب کے اُس خطاب میں ملے گی جو "ساقیٔ محمدیؐ" کے عنوان سے اسی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے۔

۳۔ غلامی اور ارتداد

آئین میں غلامی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور مرتد کی کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی بلکہ ہر ایک کے لئے مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ قارئین کو معلوم ہے کہ (دیگر مولوی صاحبان کی طرح) مودودی صاحب کے نزدیک "از روئے اسلام" دشمن کے قیدی مردوں کو غلام اور اُن کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ وہ اس باب میں اس قدر "پکے مسلمان" واقع ہوئے ہیں کہ انہوں نے صاف طور پر لکھا ہے کہ "اُن کے اسلام" کی حکومت قائم ہو گئی تو ایک سال کے بعد جو لوگ، اُن کے معیار کے مطابق مسلمان ثابت نہیں ہوں گے، انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ مجلسِ آئین ساز میں جماعتِ اسلامی کے نمائندہ، پروفیسر غفور احمد صاحب موجود تھے۔ اور انہیں حزبِ مخالف کے متحدہ محاذ میں بھی نمایاں پوزیشن حاصل تھی۔ لیکن نہ انہوں نے پارلیمان کے اندر ان "خلافِ اسلام" شقوں کے خلاف کوئی آواز بلند کی۔ نہ اس جماعت نے پارلیمان سے باہر کوئی احتجاج کیا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ حضرات خود اپنے پیش کردہ اسلام کے تحفظ کے متعلق بھی کس حد تک (SERIOUS) ہیں؟ لیکن جب ہنگامہ آرائی مقصود ہوگی تو آئین کی انہی شقوں کو خلافِ اسلام قرار دے کر "اعلانِ جہاد" کر دیا جائے گا۔

۴۔ اس وقت تک جتنے آئین مرتب ہوئے ہیں ان میں ایک چیز بڑی نمایاں نظر آتی ہے۔ یعنی اُن میں یہ بھی لکھا ہوتا

ہے کہ ملک میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا اور اس کے ساتھ ایک الگ باب میں یہ بھی لکھا ملتا ہے کہ مملکت عصمت فروشی، قمار بازی، شراب نوشی اور ربٰو کو ممنوع قرار دینے کے لئے ضروری اقدامات کرے گی۔ اس کا پچیس سال میں کسی نے نہیں سوچا کہ جب ملک کے قوانین کتاب و سنت کے مطابق ہوں گے تو پھر عصمت فروشی، قمار بازی وغیرہ کے ممنوع قرار دینے کے لئے کسی الگ چارہ جوئی کی بھی ضرورت ہوگی؟

اسی طرح ہر دستور میں یہ لکھا ملتا ہے کہ حکومت زکوٰۃ کی تنظیم کے لئے ضروری اقدامات کرے گی۔ یعنی ان کے نزدیک اسلامی مملکت میں بھی زکوٰۃ کی کوئی الگ مد ہوگی، حکومت کو جس کی جداگانہ تنظیم کی ضرورت پڑے گی آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح پچھلی بھیڑیں آنکھیں بند کئے، اگلی بھیڑ کے پیچھے پیچھے چلی آرہی ہیں!

(۶)

جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، ہم آئین کی جزئیات کے متعلق تفصیل سے کچھ نہیں لکھنا چاہتے۔ ہم نے سابقہ اشاعت میں لکھا تھا کہ ہمارے نزدیک، ملک میں کسی آئین کا ہونا خواہ وہ غیر معیاری ہی کیوں نہ ہو، بے آئینی سے بہر حال بہتر ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب ملک میں آئین کے مسئلے پر ہنگامہ آرائیاں نہ کی جائیں اور مملکت جن بنیادی مشکلات سے دوچار ہے، متحدہ طور پر ان کے حل کی تدابیر سوچی جائیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آئین میں اکثریتی پارٹی نے اپنے برسرِ اقتدار رہنے کی زیادہ سے زیادہ گنجائشیں پیدا کر لی ہیں۔ ایسا کہنے والے یہ نہیں سوچتے کہ یہ چیز مغربی نظامِ جمہوریت کی بنیاد میں داخل ہے۔ اس نظام کی رو سے اکثریتی پارٹی اپنا استحکام زیادہ سے زیادہ چاہتی ہے لیکن اقلیتی جماعتیں اس بنیادی حقیقت کو فراموش کر دیتی ہیں اور ملک میں ہنگامہ آرائی شروع کر دیتی ہیں اور نہیں سوچتیں کہ جب انہوں نے "جمہوری ببول" کے بیج بوئے ہیں تو اس کے کانٹوں کی خلش سے چیخنا کیسا ہے ——— جب عشق کیا ہے تو صبر بھی کر، اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ باقی رہا یہ اعتراض کہ اگر (بفرضِ محال) اکثریتی پارٹی کسی وقت مملکت فروشی پر اتر آئے تو پھر کیا کیا جائے، تو اس کے لئے آئین میں ایسی شق رکھنی چاہیئے جس کی رو سے وہ ایسا نہ کرنے پائے۔ اگر قانون، ایک فرد (یا کسی گروہ) کو اس قسم کے اقدامات سے روک سکتا ہے، تو وہ اکثریتی پارٹی کو اس سے کیوں نہیں روک سکتا۔ اکثریتی پارٹی تو ایک طرف، قرآن کریم نے تو حضور رسالتمآب تک سے بھی یہ اعلان کرا دیا تھا کہ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ (۶/۱۵)۔ اگر میں بھی قانون سے سرکشی برتوں تو اس کے مواخذہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ آئین کی رو سے حکمرانی اور بالادستی مبنی برحق قانون کی ہونی چاہیئے نہ کہ افراد یا پارٹیوں کی، خواہ وہ پارٹی برسرِ اقتدار ہی کیوں نہ ہو۔ مطلب ہمارا یہ ہے کہ جب آپ مغرب کے جمہوری نظام کو اختیار کرتے ہیں تو اس کے حسن و قبح دونوں کو قبول کرنا ہوگا۔ اس پر ہنگامہ آرائی تو جائز نہیں قرار پا سکتی۔

باقی رہی اکثریتی پارٹی تو اسے یہ سوچ لینا چاہیئے کہ اس کے برسرِ اقتدار رہنے کا راز اس میں ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے کہ اسے آنے والے الیکشن میں پہلے سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے حالات، قوم کی دلجوئی، سکون بخشی، اطمینانِ قلبی، عدل گستری اور رفاہ الحالی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

بملازمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے
کہ جہاں تواں گرفتن، بہ نوائے دلنوازے

حقائق و عبر

۱۔ مملکتوں کو مصاحب ڈبوتے ہیں!

(۱) سین۔ دربار اودھ

(۱) اچھو میاں!

جی سرکار!!

پالکی کی سواری بھی کیا عجیب ہوتی ہے!

سبحان اللہ سرکار! خدا نے کیا سواری بنائی ہے۔ لکھتے جائیے، پڑھتے جائیے، بیٹھے جائیے، لیٹے جائیے، پیٹ کا پانی نہیں ہلتا۔

لیکن اچھو میاں! اس میں ذرا باگ پراسے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

لعنت بھیجیے سرکار! کوئی سواری ہے! چلتا ہوا جنازہ ہے۔ بس کلمہ پڑھنے کی دیر ہے۔

(۲) — اچھو میاں!

جی سرکار!!

بینگن کی ترکاری بھی کیا ترکاری ہے!

سبحان اللہ سرکار! بہشتی ترکاری ہے، خالی پکاؤ تو لذیذ، گوشت میں ڈالو تو لذیذ۔ ایک روٹی کھاتی ہو تو انسان چار کھا جاتا ہے۔ ترکاری کیا ہے ایک ٹانگ کا تیتر ہے۔

لیکن اچھو میاں! یہ ذرا گرم ہوتی ہے۔

لعنت بھیجیے سرکار! .... چالیس دن کھانے سے آدمی اندھا ہو جاتا ہے

(ب) سین — پاکستان

"حکومت پنجاب نے اعلان کیا ہے کہ ۲۱ اپریل کو یوم اقبال کے سلسلہ میں سرکاری دفاتر اور صنعتی اداروں میں تعطیل نہیں ہوگی۔ البتہ اس روز تعلیمی ادارے بند رہیں گے۔

یہ فیصلہ مستحسن ہے۔ تعلیمی ادارے بھی کھلے رہتے تو بہتر تھا۔"

(امروز۔ ۲۰ اپریل ۱۹۷۳ء)

(۰)

۲۔ بابُ الاسلام سندھ

سرحد اور بلوچستان سے تو چار قومیتوں کی آوازیں مسلسل آ رہی ہیں لیکن سندھ کی فضا کچھ دنوں سے خاموش تھی۔ اب اس میں پھر ارتعاش پیدا ہوا ہے، یا یوں کہیے کہ اس کی اطلاعات باہر کی دنیا میں اب آئی ہیں۔ چنانچہ مسٹر جی۔ ایم سید نے ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو سندھ یونیورسٹی میں سندھی شام کے موقعہ پر ایک تقریر کی تھی جس کا متن ان کے ہمخیال رسالے "اگیتی قدم" کے ماہ اپریل کے شمارہ میں شائع ہوا۔ اس کے ضروری اقتباسات کا اردو ترجمہ معاصر جسارت (۷ مئی) کے شکریہ کے ساتھ پیش قارئین ہے :۔

"۱۔ قومی نظریہ

اس نظریہ کے مختلف تصورات پر مبنی معلومات حاصل کرنے کے بعد ایک نظریہ کو قبول کرتا ہے۔ میں غور و فکر اور تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سندھ کے لوگ، زبان، کلچر، تاریخی روایات اور اقتصادی مفادات کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم ہیں۔ اس لئے وہ سیاسی اور اقتصادی آزادی کا خود فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

۲۔ ملکی آئین سازی

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پہلے اس بات کا فیصلہ کرنا پڑیگا کہ آئین ایک قوم کی بنیاد پر بنایا جائے گا یا چار قوموں کی بنیاد پر۔ اول الذکر نظریہ کے مطابق سندھی اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے اور اکثریتی صوبوں کی کثرت رائے کے محتاج بن جائیں گے۔ دوسرے نظریہ کے مطابق کوئی بھی آئین سندھیوں کی رضامندی کے بغیر نہیں بن سکتا۔

۳۔ ایک قومی نظریہ

(۱) اس نظریہ کی بنا پر اکثریتی آبادی کا صوبہ ملٹری اور سول سروس کی وجہ سے سندھ پر اپنا تسلط جمائے گا۔

(۲) اس نظریہ کی بنا پر سندھ کی زمین، کارخانے اور ملازمتوں پر دوسرے "ملک" قابض رہیں گے۔

(۳) اس نظریہ کی بنا پر لوگ یہاں سے روپیہ کما کر باہر لے جائیں گے۔

(۴) اس نظریہ کی بنا پر ہم نظریہ پاکستان، اسلامی آئین، مضبوط مرکز کے تسلط سے نہیں نکل سکیں گے۔

(۵) اس نظریہ کی بنا پر درآمد و برآمد، ریلوے، ریڈیو، ٹیلیویژن، ٹیلیگراف اور دوسرے اقتصادی اداروں پر مرکزی حکومت کا قبضہ ہو جائے گا۔

(۶) اس نظریہ کی بنا پر مرکزی اسمبلی میں سندھیوں کو آبادی کے لحاظ سے نمائندگی ملے گی۔

(۷) اس نظریہ کی بنا پر دفاع، خارجہ معاملات اور کرنسی کے علاوہ دوسرے شعبوں پر مرکز کا قبضہ ہو جائے گا۔

(۸) اس نظریہ کی بنا پر، مرکزی حکومت کی ملازمتوں میں اس وقت کی طرح سندھیوں کو صرف ایک فیصد ملازمتیں ملیں گی۔

(۹) اس نظریہ کی بنا پر سول سروس مرکزی حکومت کے ہاتھ میں چلے جانے کی وجہ سے صوبائی خود مختاری لا حاصل ہو جائے گی۔

(۱۰) اس نظریہ کی بنا پر "ملک" کی قومی زبان غیر ملکی زبان بن جائے گی۔

(۱) اس نظریہ کی بنا پر پڑوسی ملکوں سے مخاصمانہ پالیسی برقرار رہے گی۔

(۲) اس نظریہ کی بنا پر سوشلزم پوری طرح نافذ نہیں ہو سکے گا۔

۴۔ قوم پرستی کسے کہتے ہیں؟

میں اوپر یہ عرض کر کے آیا ہوں کہ ہم سندھی جداگانہ قوم پر یقین رکھتے ہیں لیکن دیکھنا اب یہ ہے کہ سندھی قوم پرستی کے بنیادی جزکون سے ہیں؟ میری نگاہ میں وہ یہ ہیں:۔

ا۔ سندھ کے جداگانہ ملک ہونے میں یقین رکھنا۔

ب۔ پاکستان ایک ملک نہیں بلکہ چار جداگانہ ملکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں یقین رکھنا۔

ت۔ سندھی وطن، زبان، کلچر، تاریخی روایات، سیاسی اور اقتصادی مفاد کی بنیادوں پر جداگانہ قوم ہے۔

ج۔ سندھی قوم جداگانہ حیثیت میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔

د۔ سندھی قوم پرستی کی راہ میں نظریۂ پاکستان، اسلامی نظریہ حکومت اور مضبوط مرکز رکاوٹ ہیں۔

۵۔ سیکولر نظامِ حکومت

پوری دنیا میں حکومتوں کا نظام سیکولر بنیادوں پر چل رہا ہے لیکن پاکستان میں ایک سامراجی مستقل مفاد عوام کی توجہ ملک کے حقیقی مسائل سے ہٹانے کے لئے اسلامی نظامِ حکومت کا راگ الاپتے ہیں۔ اس کا مقصد عقل کے بدلے مذہب کے نام پر ملا کی نگرانی میں حکومت چلانی ہے۔

۶۔ اسلامی آئین اور اسلامی حکومت

ملک کا آئین معاشرے کے حالات کے مطابق بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح نظامِ حکومت کو ملک کے حالات کے مطابق تشکیل دیا جاتا ہے۔ اس لئے اسلامی آئین اور اسلامی حکومت ہوتے ہی نہیں ہیں۔ جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو بیوقوف ہیں یا دھوکہ باز۔

۷۔ حکومت کی پالیسی

سندھیوں کے پاس ہر آنے والی حکومت کی پالیسی کو جانچنے کے لئے کچھ معیار ہونے چاہئیں جس کے مطابق ان کے غلط اور صحیح ہونے کا فیصلہ کیا جائے میری نظر میں وہ معیار یہ ہیں:۔

(۱) نظریۂ پاکستان میں اعتماد رکھنے والی حکومت سندھیوں کو کبھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

(۲) مضبوط مرکز میں اعتماد رکھنے والی حکومت سندھ کی دشمن ہے۔

(۳) اسلامی آئین یا اسلامی حکومت پر یقین رکھنے والی حکومت سندھ کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔

(۴) سندھیوں کی جداگانہ قوم اور سندھو دیش سے انکار کرنے والی حکومت سندھ دشمن شمار کی جا سکتی ہے۔ "

یہ ہیں وہ خیالات جنہیں سندھ میں عام کیا جا رہا ہے؟

[ابھی ابھی (دوران طباعت) کو خبر چھپی ہے کہ مسٹر سید کو حکومت نے تین ماہ کے لئے نظر بند کر دیا ہے۔ لیکن غالباً یہ اُن کی اس تقریر کی بنا پر نہیں ہوا۔]

(۰)

۳۔ اقبالیت

یومِ اقبالؒ کی تقریب کے سلسلہ میں معاصر مساوات (لاہور) نے چند ایک سوال، ملک کے مختلف مفکرین کے پاس بھیجے اور انہیں (معہ ان کے جوابات کے) اپنی اشاعت بابت ۲۱ اپریل ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔ وہ سوالات اور پرویز صاحب کی طرف سے دیئے گئے ان کے جوابات درج ذیل ہیں:۔

"آپ نے جو سوالات مرتب کئے ہیں وہ اس قدر جامع ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے تفصیلی جواب کے لئے ایک کتابچہ کی ضرورت ہوگی اور اگر ان جوابات کو یکجا کر دیا جائے تو اس طرح فکر و پیامِ اقبال کے متعلق ایک اچھی خاصی خودکفیل تصنیف مرتب ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے نہ وقت ہے نہ گنجائش۔ اس لئے میں نہایت مختصر جوابات پہ اکتفا کروں گا۔

سوالات تک آنے سے پہلے تمہیداً عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے نزدیک علامہ اقبالؒ کی عظمت و عقیدت اسلئے ہے کہ ان کی فکر کا سرچشمہ قرآنِ کریم ہے۔ استنباطِ نتائج میں ان کی فکر سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن اس کے سرچشمۂ فکر کی صداقت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ میں خود قرآن کریم کا طالب العلم ہوں اور میں نے فکر و پیامِ اقبالؒ کا مطالعہ اسی کتابِ منیر کی روشنی میں کیا ہے۔ اس لئے میرے جوابات بھی اصولی طور پر اسی پر مبنی ہوں گے۔ اب سوالات کی طرف آیئے۔

(۱) سوال:۔ اقبالؒ نے اپنی شاعری، فلسفے اور سیاست میں کس مسئلہ کو بنیادی اہمیت دی ہے اور اس کا حل کیا تجویز کیا ہے؟

جواب:۔ اقبالؒ کی فکر اور پیغام کا نقطۂ ماسکہ مقامِ آدمیت ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کی روشنی میں انسان کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کرایا۔ انہوں نے بتایا ہے کہ انسانی زندگی کی غایت کیا ہے۔ اس کی مضمر صلاحیتیں اور ان کی وسعتیں کیا۔ کائنات میں اس کا مقام کیا ہے اور مستقبل کیا۔ چونکہ فرد کی صلاحیتوں کی نشوونما، جماعت کے اندر ممکن ہے اور وہ اپنی منزلِ مقصود تک بھی اسی کارواں کا ہمسفر ہو کر پہنچ سکتا ہے، اس لئے اقبالؒ قرآن کے متعین کردہ اجتماعی نظامِ حیات کی اہمیت کو اجاگر کرتا اور اس کے اساسی خطوط وضاحت سے پیش کرتا ہے۔ اس قسم کے نظام کا قیام اس مسئلے کا حل ہے۔ یعنی اس میں اور صرف اسی میں انسان کو اس کا صحیح مقام مل سکتا ہے۔

(۲) سوال:۔ اقبالؒ کے معاشرتی انصاف کی عملی شکل کیا ہے۔؟

جواب:۔ معاشرتی انصاف غالباً سوشل جسٹس کا ترجمہ ہے۔ یہ اصطلاح بڑی وسیع ہے لیکن آجکل اس سے عام طور پر مراد معاشی نظام لیا جاتا ہے۔ اقبالؒ کے معاشرتی انصاف کی بنیاد قرآن کے معاشی نظام پر ہے۔ اس نظام کی رو سے تمام افراد اپنی اپنی استعداد کے مطابق کام کرتے ہیں اور ان کی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا نظامِ مملکت کی ذمہ داری ہوتا ہے۔ ان افراد کے لئے اشیائے زیست کی مقدار میں تو حسبِ ضرورت فرق ہو سکتا ہے لیکن معیارِ زیست تمام افراد کا ایک جیسا ہوتا ہے۔ نیز اس میں افرادِ معاشرہ کو رزق ہی نہیں ملتا۔ رزقِ کریم ملتا ہے۔ یعنی اس میں ہر ایک کی عزتِ نفس بھی محفوظ ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام خارج سے عاید کردہ قوانین کی رو سے قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ افرادِ معاشرہ کے دل کی

گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیا جائے کہ اس نظام کی اہمیت اور ضرورت ان کے ایمان کا تقاضا بن جائے۔ وہ جان مار کر محنت کریں اور اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے لئے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں۔ اس کے سوا اس نظام کی عملی تشکیل کی کوئی صورت نہیں۔

۳۔ سوال :۔ اقبالؒ کیسا پاکستان چاہتے تھے؟

جواب :۔ اقبالؒ ایک ایسا پاکستان چاہتے تھے جو پکار پکار کر کہہ دے کہ ؎

کس درایں جا سائل و محروم نیست ؛ عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

۴۔ سوال :۔ موجودہ صورتِ حال میں اقبالؒ کی شاعری کیا معنی رکھتی ہے؟

جواب :۔ موجودہ صورتِ حال میں (یعنی اس وقت) اقبالؒ کی شاعری قوالی بن کر رہ گئی ہے جسے اُس نے افیون کہہ کر پکارا تھا۔ اقبالؒ ساری عمر کہتا رہا کہ میں شاعر نہیں۔ شاعری مجھ پر تہمت ہے، میں تو ایک پیغام بر ہوں لیکن ہم نے اس کے پیغام کو تو پس پشت ڈال دیا اور اس کی شاعری کو مقصود بالذات سمجھ لیا۔ اس طرح جیسے اسلام دین کی سطح سے نیچے اتر کر مذہب کی سطح پر آگیا ہے، اقبالؒ پیغامبر سے صرف شاعر بن کر رہ گیا ہے۔ اور یہ اس کے ساتھ انتہائی ظلم ہے اور قوم کی حرماں نصیبی۔

۵۔ سوال :۔ جدید شاعری پر اقبالؒ کا اثر کس قدر ہے؟

جواب :۔ اقبالؒ ایک پیغامبر تھا اور شاعری اس کے پیام کا ذریعۂ اظہار و ابلاغ۔ اس کی شاعری کا یہ اثر ہوا کہ ہمارے شعراء نے شعر میں پیغام کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن اس انداز کا نبھانا بڑا مشکل تھا۔ عام طور پر، شعر میں اگر فکر یا پیغام آجائے تو اس کی شعریت ختم نہیں تو مجروح ضرور ہو جاتی ہے اور وہ شعر وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ اور اگر شعریت کو باقی رکھا جائے تو پیغام باقی نہیں رہتا۔ اقبالؒ کے ہاں یہ امتزاج بڑے حسین اور کامیاب انداز میں موجود ہے۔ لیکن جن شعراء نے اس کا اتباع کرنا چاہا وہ اس میں بہت کم کامیاب ہوئے ہیں۔ بایں ہمہ اقبالؒ کی شاعری نے ہمارے ہاں کے روایتی انداز کو متاثر ضرور کر دیا ہے۔

۶۔ سوال :۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کا جدید اسلامی فلسفے میں کیا مقام ہے؟

جواب :۔ میں اس سوال کو سمجھ نہیں سکا۔ اسلام نے اصطلاحی معنوں میں کوئی فلسفہ نہیں دیا۔ اس نے اصول اور اقدار پر مبنی نظامِ زندگی اور ضابطۂ حیات دیا ہے جنہیں علم و بصیرت کی رُو سے پیش کیا اور دلائل و براہین کی رُو سے سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے۔ اگر اسے فلسفہ کہا جا سکتا ہے تو اس میں قدیم و جدید کی تفریق ہی غلط ہے۔ یہ اصول و اقدار غیر متبدل ہیں۔ اس لئے ان میں قدامت اور جدّت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ خطباتِ اقبالؒ عصرِ حاضر کے علوم کی روشنی میں قرآنی نظریاتِ حیات کو سمجھانے کی انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح ان میں ترمیم و ارتقاء کی گنجائش ہے۔ بایں ہمہ وہ اس باب میں السابق ہیں اور السابق کا بہرحال اپنا مقام ہوتا ہے۔

طلوعِ اسلام نہ ملنے کی شکایت

شکایت موصول ہونے پر پندرہ تاریخ تک پرچہ دوبارہ ارسال کیا جا سکے گا۔ اُس کے بعد اطلاع آنے پر (اگر موجود ہوا تو) قیمتاً بھیجا جائے گا۔ خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ ضروری ہے۔

ناظم

رابطہ باہمی

تقریباتِ یومِ اقبال کے سلسلے میں مفکرِ قرآن کے خصوصی دورے!

۲۴ راپریل - لائل پور

یوں تو اس دور میں طلوعِ اسلام کی آواز ہر صاحبِ فکر کے دل کی آواز بن چکی ہے۔ لیکن ابھی ایسے حضرات بھی ہیں جن تک یہ آواز ابھی تک نہیں پہنچی۔ ان حضرات تک قرآن کے اس پیغام کو پہنچانے کے لئے بزمِ طلوعِ اسلام لائلپور نے ڈسٹرکٹ کونسل کے وسیع ہال میں محترم پرویز صاحب کے خطاب بعنوان "خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی" کا اہتمام کیا۔ یہ کھلا اجلاس بعد نماز مغرب قریب ۷ بجے شام شروع ہوا۔ لائلپور اور اس کے گرد و نواح کے احبابِ قرآنی کی کثیر تعداد نے اس میں شمولیت کی۔ اس طرح یہ جلسہ نہایت پُروقار انداز سے اختتام پذیر ہوا۔

اس جلسے کی صدارت محترم ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب نے فرمائی۔ اس خطاب کے بعد مفکرِ قرآن نے سامعین کے استفسارات کے جوابات دیئے۔ اس طرح ایک مختصر سی مجلسِ استفسارات بھی منعقد ہو گئی جس سے شرکائے مجلس حضرات پر بڑا گہرا اثر ہوا۔

ادارہ تمام اراکین و معاونین بزم لائلپور کو اس اجلاس کی کامیابی پر مبارک باد دیتا ہے۔

۲۷ راپریل - جلال پور جٹاں

گجرات شہر سے قریب ۸ میل کے فاصلے پر یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں فکرِ قرآنی کے چند دلدادگان اس شمع کو روشن سے روشن تر کرنے میں مصروف ہیں۔ ان میں محترم ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب کا اسمِ گرامی نمایاں ہے۔

۲۷ راپریل بعد نماز عصر محترم پرویز صاحب نے "دو قومی نظریہ" کے موضوع پر نہایت دل آویز اور خیال افروز خطاب فرمایا۔ گجرات بزم کے نمائندہ محترم شیخ قدرت اللہ ایڈووکیٹ صاحب نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ گرد و نواح کی بزموں کے اراکین و نمائندگان نے بھی اس اجلاس میں شرکت فرمائی۔ یہ جلسہ حاضری اور حسنِ نظم و ترتیب کے اعتبار سے توقعات سے کہیں بڑھ کر کامیاب رہا۔

ادارہ ڈاکٹر صاحب اور دیگر تمام اراکینِ بزم کو اس ایمان افروز محفل کے انعقاد پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

ناظم

خط لکھیے — علمی، ادبی اور اسلامی — کتب و رسائل منگانے کے لئے —
پتہ:- مبلغو اے۔ بی سنٹر، 21/2 مین مارکیٹ گلبرگ لاہور

از :- شاہد عادل

تفہیم القرآن جلد پنجم (مودودی صاحب) پر ایک نظر

غلامی سے متعلق اسلامی قانون

تہذیب جدید کا انسانیت پر یہ احسان عظیم ہے کہ اس وقت روئے زمین سے غلامی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں اسلام کے ایسے مایۂ ناز مفکر بستے ہیں جو اب بھی اسلام کے نام پر غلامی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اس بارے میں ان کے مسلک کی تفصیلات تفہیم القرآن کی پچھلی جلدوں کے تبصروں میں گذر چکی ہیں۔ جلد زیر تبصرہ کی ابتدا سورۃ محمدؐ سے ہوتی ہے جس میں ایک ایسی آیت ہے جس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن میری طرح قارئین طلوع اسلام بھی یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ مودودی صاحب غلامی کا خاتمہ کرنے والی اسی آیت سے غلامی کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ آیت یہ ہے:۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً

یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو اس کے بعد تمہیں اختیار ہے احسان کرو یا فدیہ کا معاملہ کرو۔

یہ بڑا واضح شرعی حکم ہے کہ لڑائی کے خاتمے پر جنگی قیدیوں پر احسان کر کے یا ان سے فدیہ کا معاملہ کر کے انہیں رہا کر دو۔ غلامی کا سرچشمہ جنگی قیدی تھے اور جنگی قیدیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرما کر اس سرچشمہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ جو مفسرین غلامی کے جواز کے قائل تھے انہیں اس آیت کی تفسیر میں طرح طرح کی الجھنیں پیش آتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اس واضح شرعی حکم سے پیچھا چھڑانے کے لئے سرے سے اس آیت ہی کو منسوخ قرار دے دیا۔ (ملاحظہ ہو احکام القرآن جلد سوم ص۱۱۵)۔ تاہم جو مفسر اسے منسوخ نہیں سمجھتے وہ اس کے واضح معانی کا انکار نہیں کرتے بلکہ تسلیم کرتے ہیں کہ ظاهرہ یقتضی احد شیئین من او فداء و ذالک ینفی جواز القتل۔ (یعنی) اس آیت کے ظاہر معانی دو امور یعنی احسان کرنے یا فدیہ لینے پر دلالت کرتے ہیں اور اس سے جنگی قیدیوں کو قتل کرنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔" احکام القرآن کی یہ عبارت ہم نے اس لئے نقل کی ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ابتدائی جنگوں مثلاً غزوہ بدر، غزوہ احد اور غزوہ خیبر میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطرناک قسم کے جنگی قیدیوں کو قتل کر دیا تھا۔ لیکن اس آیت میں اس کی ممانعت کر دی گئی اور ان کے ساتھ معاملے کے صرف دو راستے کھلے چھوڑے۔ ایک احسان اور دوسرا فدیہ۔ اس طرح یہ آیت غلامی کے بارے میں آخری شرعی حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور کسی حد تک خود مودودی صاحب بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی آیت

کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں :۔

جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوں اُن کے بارے میں فرمایا گیا کہ تمہیں اختیار ہے خواہ ان پر احسان کرو یا ان سے فدیہ کا معاملہ کرلو۔ اس سے عام قانون یہ نکلتا ہے کہ جنگی قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حسن بصریؒ، عطاء اور حماد بن ابی سلیمان قانون کے اسی عموم کو لیتے ہیں اور یہ اپنی جگہ درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی کو قتل لڑائی کی حالت میں کیا جاسکتا ہے جب لڑائی ختم ہو گئی اور قیدی ہمارے قبضے میں آگیا تو اسے قتل کرنا درست نہیں ہے۔ ابن جریر اور ابوبکر جصاص کی روایت ہے کہ حجاج بن یوسف نے جنگی قیدیوں میں سے ایک قیدی کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ اسے قتل کر دیں۔ انہوں نے انکار کر دیا اور یہ آیت پڑھ کر فرمایا کہ ہمیں قید کی حالت میں کسی کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے"

(تفہیم القرآن جلد ۵ طبع دوم صفحہ ۱۲-۱۳)

غلامی کی حرمت والی آیت سے غلامی کا جواز

مودودی صاحب کی روشن خیالی کے بارے میں جو عظیم پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے تو وہ کبھی کبھی اس کی لاج رکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ غلامی کے جواز کے قائل ہونے کے باوجود وہ غلامی کے جواز کے قائل مفسرین کی طرح اس آیت کو منسوخ قرار نہیں دیتے کیونکہ اس صورت میں قرآن مجید پر "تضاد بیانی" کا الزام عاید ہوتا ہے۔ لیکن وہ جس طرح "احسان" کی تفسیر سے کھینچ تان کر غلامی کا جواز نکالتے ہیں اس سے ان کی روشن خیالی کا بھانڈا چوراہے کے بیچ پھوٹ جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"احسان میں چار چیزیں شامل ہیں۔ ایک یہ کہ قید کی حالت میں ان سے اچھا برتاؤ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قتل یا دائمی قید کے بجائے ان کو غلام بنا کر افراد مسلمین کے حوالے کر دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ جزیہ لگا کر ان کو ذمی بنا لیا جائے۔ چوتھے یہ کہ ان کو بلا معاوضہ رہا کر دیا جائے۔ (صفحہ ۱۴)

احسان کی یہ بالکل نئی اور اچھوتی تفسیر ہے کہ جنگی قیدیوں سے ہر قسم کی خدمت لو۔ ان کی عورتوں کو ان سے جدا کر کے بغیر نکاح کے اپنے استعمال میں لاؤ۔ اور جب مودودی صاحب کی عطا کردہ "تمتع کی اجازت" سے بے حد و حساب لونڈیوں سے لطف اندوزی سے جی بھر جائے تو پھر انہیں دوسرے کے پاس اسی مقصد کے لئے فروخت کر دو۔ شکر ہے کہ مودودی صاحب نے احسان کی یہ تفسیر اردو زبان میں کی ہے۔ اگر کسی اور بین الاقوامی زبان میں ہوتی تو معلوم نہیں دشمنانِ اسلام اسلامی تعلیمات پر کیا کیا کیچڑ اچھالتے [1]

کفر و اسلام کی جنگ میں مومن کا رویّہ

سورۃ محمدؐ کی آیت نمبر ۲۶ ——— ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِسْرَارَهُمْ ۔ (اس لئے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے۔ اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں :۔

---

[1] یہ سمجھ ہو جائے گا کیونکہ اب اس تفسیر کے انگریزی ترجمے کے بھی اہتمامات ہو رہے ہیں۔ خدا معلوم اس سازش کے پیچھے کون کونسی اسلام دشمن قوتیں کارفرما ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

یہ آیات اس معاملہ میں بالکل ناطق ہیں کہ کفر و اسلام کی جنگ میں جس شخص کی ہمدردیاں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ نہ ہوں یا کفر اور کفار کے ساتھ ہوں اس کا ایمان ہی سرے سے معتبر نہیں ہے۔ کجا کہ اس کا کوئی عمل خدا کے ہاں مقبول ہو۔ (صفحہ ۲۹)

ہمارے علماءِ اسلام کی جو تعلیمات عامۃ الناس کے سامنے پیش کرتے ہیں، اگر وہ خود بھی اس پر عمل کرتے تو دنیا جنت بن جاتی۔ (مثلاً) اسی سب سے اہم مسئلے یعنی کفر و اسلام کی جنگ میں خود مودودی صاحب کا کردار ملاحظہ ہو۔ جس وقت تحریکِ پاکستان اپنے پورے عروج پر تھی، علماء کی طرف سے اس کی مخالفت ہو رہی تھی۔ لیکن اسی وقت علماء ہی کی ایک قابلِ صد احترام ہستی علامہ شبیر احمد عثمانی نے یہ فتوےٰ دیا کہ اس وقت مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے قیام کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ ایک قسم کی کفر و اسلام کی جنگ ہے۔ تاہم وہ بڑے حقیقت پسند عالمِ دین تھے اس لئے اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ پاکستان کا نام سن کر کسی شخص کو یہ غلط فہمی یا خوش فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ اس خطہ میں بلا تاخیر فوراً خلافتِ راشدہ یا خالص قرآنی اور اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ ضرورت سے زیادہ امیدیں دلانا یا توقعات باندھنا کسی عاقبت اندیش حقیقت پسند کے لئے زیبا نہیں۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان ایک ایسا ابتدائی قدم ہے جو انجام کار قرآنی اصول کے مطابق احکم الحاکمین کی حکومتِ عادلہ قائم ہونے پر کسی وقت منتج ہو سکتا ہے۔ (روزنامہ منشور۔ دہلی۔ بابت ۱۲/ نومبر ۱۹۴۵ء)

چنانچہ اس وقت جو اس مقصد کے لئے ووٹ ہو رہے تھے انہیں پاکستان کے حق میں دلوانے کے لئے انہوں نے ملک گیر دورہ کیا اور اس کے خاطر خواہ نتائج قیامِ پاکستان کے حق میں نکلے۔

مودودی صاحب جس طرح قیامِ پاکستان کے مخالف تھے اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں صرف یہ دکھلاتے ہیں کہ علامہ صاحب کی کوششوں سے بعض ایسے لوگ بھی متاثر ہو گئے جن کا تعلق جماعتِ اسلامی سے تھا لیکن پاکستان کے حق میں ووٹ دینے سے پہلے انہوں نے ایک دفعہ پھر اپنے امیر جناب مودودی صاحب سے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے اس کفر و اسلام کی جنگ میں جو مومنانہ رویہ اختیار کیا اسے ان ہی کی زبانی سنیئے۔

ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے اسی طرح کے انتخابات کی اہمیت جو کچھ ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو بہرحال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ (رسائل و مسائل مطبوعہ لاہور حصہ اوّل صفحہ ۳۴۴)

ہو سکتا ہے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے، قیامِ پاکستان کی جنگ کو کفر و اسلام کی جنگ قرار دینے کے بارے میں مودودی صاحب کو کوئی شبہ ہو لیکن قیامِ پاکستان کے بعد تو وہ اٹھتے بیٹھتے اس کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ انہی کے الفاظ ہیں۔

اس ملک کے مستقبل اور اس کی آفرینش کا انحصار ایک ہی چیز پر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ تحریکِ پاکستان کے دوران میں کیا گیا تھا اسے ایمانداری سے پورا کیا جائے۔ وعدہ یہ تھا کہ اس سرزمین کو اسلام کا گہوارہ بنایا جائے گا۔ اس میں اسلام کا قانون نافذ کیا جائے گا۔ (ہفت روزہ ایشیا۔ لاہور۔ بابت ۴ فروری ۷۳ء)

اپنے اس فیصلے کی روشنی میں وہ خود ہی فرما دیں کہ کفر و اسلام کی جنگ میں ان کا رویہ کس قسم کا تھا؟ مومنانہ یا کافرانہ؟

اور ان کی ہمدردیاں کس گروہ کے ساتھ تھیں۔

صحابیٔ رسولؐ پر فسق کی تہمت

ہمارے ہاں شانِ نزول کے تحت عجیب و غریب قصے کہانیاں اور واقعات نقل کر دیتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اس امر کا خیال بھی نہیں رکھا جاتا کہ اس سے خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ ہستیوں کی سیرت کس قدر داغدار ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ الحجرات کی چھٹی آیت یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ۔ (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو۔ اور پھر اپنے کئے پر پشیمان ہو) کی تفسیر کی تائید میں لکھتے ہیں۔

اکثر مفسرین کا بیان ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ قبیلہ بنی المصطلق جب مسلمان ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو بھیجا تاکہ ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کر لائیں۔ یہ ان کے علاقے میں پہنچے تو کسی وجہ سے ڈر گئے اور اہلِ قبیلہ سے ملے بغیر مدینہ واپس جا کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے شکایت کر دی کہ انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے اور وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ حضورؐ یہ خبر سن کر سخت ناراض ہوئے اور آپ نے ارادہ کیا کہ ان لوگوں کی سرکوبی کے لئے ایک دستہ روانہ کریں۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ نے وہ دستہ روانہ کر دیا تھا اور بعض میں یہ بیان ہوا ہے کہ آپ روانہ کرنے والے تھے۔ بہر حال اس بات پر سب متفق ہیں کہ بنی المصطلق کے سردار حارث بن ضرار (ام المومنین حضرت جویریہؓ کے والد) اس دوران میں خود ایک وفد لے کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچ گئے اور انہوں نے عرض کیا کہ خدا کی قسم ہم نے تو ولید کو دیکھا تک نہیں کجا کہ زکوٰۃ دینے سے انکار اور ان کے قتل کے ارادے کا کوئی سوال پیدا ہو۔ ہم ایمان پر قائم ہیں اور ادائے زکوٰۃ سے ہمیں ہرگز انکار نہیں ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (صفحہ ۷۳، ۷۴)

آپ غور فرمائیے کہ اس افسانے سے جو یقیناً دشمنانِ اسلام کا وضع کردہ ہے اور جسے مودودی صاحب نے بطور تفسیر درج فرمایا ہے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس سے ایک تو ایک صحابیؓ کو (معاذ اللہ) فاسق اور کاذب قرار دینا پڑتا ہے اور دوسرے یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم بغیر کسی تحقیق کے محض سنی سنائی باتوں پر خود مسلمانوں کے خلاف فوج کشی کر دیتے تھے۔

ظالم حکمران کے خلاف بغاوت

سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۹ کی اپنے مفاد کے لئے ایک ایسی تشریح کرتے ہیں کہ اگر ایک دفعہ اسے تسلیم کر لیا جائے تو پھر کسی اسلامی ملک میں امن و امان قائم نہیں رہ سکے گا۔ آیت کے الفاظ یوں ہیں:۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔

اور اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ

دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو۔ یہانتک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے
پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کراؤ۔ اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنیوالوں
کو پسند کرتا ہے)

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے معاملہ میں باغی گروہ کونسا ہوگا اور حق پر کونسا۔ علماء امت نے اس بارے میں جو فیصلہ دیا ہے پہلے اُسے مودودی صاحب ہی کی زبانی سن لیجئے:-

جمہور فقہاء اور اہل حدیث کی رائے یہ ہے کہ جس امیر کی امارت ایک دفعہ قائم ہو چکی ہو۔ اور مملکت کا امن و امان اور نظم و نسق اس کے انتظام میں چل رہا ہو، وہ خواہ عادل ہو یا ظالم اور اس کی امارت خواہ کسی طور پر قائم ہوئی ہو اس کے خلاف خروج کرنا حرام ہے۔ الا یہ کہ وہ کفر صریح کا ارتکاب کرے۔ امام سرخسی لکھتے ہیں کہ جب مسلمان ایک فرمانروا پر مجتمع ہوں اور اس کی بدولت ان کو امن حاصل ہو اور راستے محفوظ ہوں۔ ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ اس کے خلاف خروج کرے تو جو شخص بھی جنگ کی طاقت رکھتا ہو اس پر واجب ہے کہ مسلمانوں کے اس فرمانروا کے ساتھ مل کر خروج کرنیوالوں کے خلاف جنگ کرے۔

(بحوالہ۔ المبسوط۔ باب الخوارج۔)(صفحہ ۷۹-۸۰)

مودودی صاحب اجماع امت کے اس فیصلہ کو نقل تو کرتے ہیں لیکن اسے خود تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ظالم اور فاسق حکمران کے خلاف خروج یعنی بغاوت کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس بارے میں وہ امام ابوحنیفہ کیطرف غلط طور پر منسوب ایک مسلک سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

امام ابوحنیفہ کا مسلک ظالم امراء کے خلاف قتال کے معاملہ میں اہل علم کو معلوم ہے۔ ابوبکر جصاص احکام القرآن میں صاف لکھتے ہیں کہ امام صاحب اس قتال کو نہ صرف جائز بلکہ سازگار حالات میں واجب سمجھتے تھے (جلد اول صفحہ ۸۱۔ جلد دوم صفحہ ۳۹) بنی امیہ کے خلاف زید بن علی کے خروج میں انہوں نے نہ صرف خود مالی مدد دی، بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرمائی (الجصاص جلد ۱ صفحہ ۸۱) منصور کے خلاف نفس زکیہ کے خروج میں وہ پوری سرگرمی کے ساتھ نفس زکیہ کی حمایت کرتے رہے۔ اور اس جنگ کو انہوں نے کفار کے خلاف جہاد سے افضل قرار دیا" (صفحہ ۸۰)

اس مسلک کی تائید کرنے کی جو سیاسی مصلحت مودودی صاحب کے پیش نظر ہے وہ ظاہر ہے۔ وہ اپنی جماعت کو صالحین کی جماعت قرار دیتے ہیں فلہٰذا اس سے باہر کے مسلمانوں کو فاسق و فاجر۔ بنا بریں جماعت اسلامی کے علاوہ اقتدار کسی کے ہاتھ میں بھی ہو، اس استدلال کی رُو سے ان کی مخالفت شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ واجب قرار پا جائیگی۔ موجودہ دور میں سب سے پہلے اخوان المسلمین کے اہل علم نے اسے اختیار کیا۔ ان کے ایک مشہور اہل علم شیخ ابوزہرہ مصری نے تو امام صاحب کی طرف غلط طور پر منسوب مسلک کو بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ زید بن علی کے خروج کو غزوہ بدر کے مماثل قرار دیتے ہیں۔

امام صاحب کیطرف غلط طور پر منسوب اس روایت کی حقیقت اور تاریخی حیثیت بیان کرنے سے پہلے ہم اس امر کی طرف بھی اشارہ کئے جاتے ہیں کہ خود الاخوان المسلمون کے حق میں بھی اس غلط مسلک کے خطرناک نتائج برآمد ہوئے۔

ایک طرف اگر الاخوان کی طرف سے مصر کے وزیر اعظم نقراشی پاشا کو قتل کرا دیا گیا تو دوسری طرف خود الاخوان المسلمون کے مرشد عام جناب حسن البنا کا بھی یہی انجام ہوا۔ صدر ناصر الاخوان المسلمون ہی کی خفیہ تنظیم کے رکن تھے اور اسی مسلک کی بنیاد پر اس نے فاروق مصر کی حکومت کا تختہ الٹا۔ لیکن بعد میں صالحین ؒ کے معیار کے مطابق وہ خود "ظالم اور فاسق" قرار دیا گیا۔ اور اس طرح اسے بھی ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ تو ختم ہونے سے بچ گیا لیکن گھر کے بھیدی ہونے کی حیثیت سے اس نے الاخوان المسلمین ہی کو ختم کر ڈالا۔ دیکھئے کہ خود الاخوان المسلمون کو ایک غلط مسلک کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

امام صاحب کی طرف منسوب غلط مسلک کی تاریخی حقیقت

اب ہم امام صاحب کی طرف منسوب اس غلط مسلک کی تاریخی حقیقت بیان کرتے ہیں۔ اور اپنی طرف سے کچھ کہے بغیر برصغیر کے مشہور مورخ اور محقق علامہ شبلی نعمانی ؒ کی زبانی اسے نقل کرتے ہیں۔ وہ امام ابوحنیفہ کی جانب سے جناب زید بن علی کی اعانت کے واقعہ کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

> جس قدر تاریخیں اور رجال کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ایک قابلِ ذکر واقعہ تھا۔ لیکن اس کی سلطنت نہایت امن و امان کی سلطنت تھی۔ ملک میں ہر طرف امن و امان کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ رعایا عموماً رضامند تھی۔ بیت المال میں ناجائز آمدنیاں نہیں داخل ہو سکتی تھیں۔ اس حال میں امام ابوحنیفہ ؒ کی مخالفت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ (سیرۃ النعمان۔ مطبوعہ دیوبند صفحہ ۵۲)

یہ تو تھی اس واقعہ کی تاریخی حیثیت۔ اب ذرا عقلی حیثیت سے بھی اس پر ایک نظر ڈالئے۔ امام ابوحنیفہ جیسے زیرک انسان ایک مسئلہ کو حق سمجھتے ہیں۔ بلکہ اسے کفار کے ساتھ جنگ سے بھی افضل قرار دیتے ہیں۔ بلکہ شیخ ابوزہرہ کے قول کے مطابق وہ اسے غزوۂ بدر کے مماثل قرار دیتے ہیں تو اسلام کے ایک سچے فدائی کے لئے یہ موقع تھا کہ وہ شہادت کا رتبہ حاصل کرتا اور شہداء بدر کا مقام حاصل کرتا۔ یہ کیا کہ وہ اتنے بڑے جہاد میں تھوڑی سی مالی امداد دے کر گھر میں خاموش بیٹھے رہے۔ اس سے قرآن کے کردار پر الٹا حرف آتا ہے کہ ایک چیز کو حق سمجھنے کے باوجود اس میں شرکت نہیں کی۔ اس طرح ان کا شمار نہ غازیوں میں اور نہ شہیدوں میں ہوا۔ اور پھر جب خروج کی ناکامی کے بعد خلیفہ نے زید بن علی کو قتل کرا دیا تو اگر امام صاحب کا بھی وہی مسلک ہوتا جو راویوں کو معلوم ہو گیا تھا تو کیا حکومتِ وقت کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا وہ زید بن علی کے ساتھ امام صاحب کا کام بھی تمام کر سکتی تھی۔ ایک اور لطف کی بات یہ ہے کہ زید بن علی کے اس خروج میں ان کے ساتھ دو صد سے بھی کم آدمی تھے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اتنے بڑے جلیل القدر امام کی علی الاعلان تائید کے باوجود کیا دو سو آدمی بھی زید بن علی کے جھنڈے تلے جمع نہیں ہو سکتے تھے۔

امام اعظم ؒ کا استحصال

مودودی صاحب کا مسلک بالکل واضح ہے۔ ان کے مفید مطلب انہیں کسی بزرگ دین کی طرف منسوب کوئی غلط بات ہی کیوں نہ مل جائے، وہ اسے آیت و حدیث سے بھی زیادہ اہمیت دے کر پیش کرتے ہیں۔ لیکن اگر اسی بزرگ کا کوئی ایسا مسلک جس سے کروڑوں انسانوں کی بھلائی ہوتی ہو اور وہ قرآن و سنت کے بھی عین مطابق ہو لیکن ہو ان کے مسلک کے خلاف، تو نہ صرف یہ کہ اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جاتا ہے بلکہ اس کی تردید میں کتابیں شائع کر دی جاتی ہیں۔ زمین کی بٹائی کے مسئلے کو لیجئے کہ جب حضور صلعم نے

واضح الفاظ میں سود قرار دیا اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے واضح الفاظ میں حرام ٹھہرایا۔ لیکن مودودی صاحب نہ صرف یہ کہ اسے جائز قرار دیتے ہیں بلکہ اس کے جواز میں ایک کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین" تصنیف فرماتے ہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیلات تفہیم القرآن جلد اول کے تبصرے میں طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۷۰ء میں گذر چکی ہیں اس لئے انہیں دوبارہ نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

اسلامی قانون میں کفو کی حقیقت

کفو سے مراد لڑکا لڑکی کا شادی کے لئے برابر حیثیت کا ہونا ہے۔ بعض طبقے اس پابندی کو اسلامی مساوات کے خلاف سمجھتے ہیں۔

لیکن حنفی فقہاء اسے نکاح کی شرط قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت اور مرد کا چھ امور میں برابر ہونا ضروری ہے ــــ

(۱) حسب نسب - (۲) اسلام - (۳) پیشہ (۴) آزادی - (۵) دینداری اور (۶) مال و دولت۔ ان کے نزدیک غیر عربی کسی عربی یا قریشی سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اس کا کفو نہیں ہے اور غیر قریش چاہے وہ عرب ہی کیوں نہ ہو قریش کا کفو نہیں ہو سکتا۔ ہاں غیر عربی عالم، جاہل عرب کا کفو ہو سکتا ہے۔ پیشے کے لحاظ سے میاں بیوی میں برابری ضروری ہے۔ عرف کے مطابق اگر درزی کا پیشہ نور بافوں سے اچھا ہو گا تو کوئی نور باف درزی کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ وغیرہ وغیرہ

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۴ صفحہ ۵۳)

ہمارے معاشرے میں ان شرائط پر عمل کرنے کے لئے ابھی تک اصرار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے نتیجے میں اسلام میں ذات پات کا نظام پوری بیرا بجولے کے ساتھ داخل ہو گیا ہے۔ مودودی صاحب بظاہر ان شرائط کو برا سمجھتے ہیں لیکن چونکہ وہ پاکستانی مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ملک میں حنفی فقہ رائج کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں اس لئے علی الاعلان تو حنفی فقہ کے اس اہم مسئلے کو رد نہیں کرتے تاہم وہ تاویلات کے ذریعے اس کی برائیاں دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بشرطیکہ حنفی فقہا بھی ان کی تاویلات کو تسلیم کر لیں۔ سورۃ الحجرات کی آیت یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ (لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہیں گروہ اور قبیلے بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔" کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

> اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کو رفع کر دینا بھی ضروری ہے۔ شادی بیاہ کے معاملے میں اسلامی قانون کفو کو جو اہمیت دیتا ہے اس کو بعض لوگ اس معنی میں لیتے ہیں کہ کچھ برادریاں شریف اور کچھ کمین ہیں اور ان کے درمیان مناکحت قابلِ اعتراض ہے۔ لیکن دراصل یہ ایک غلط خیال ہے۔ اسلامی قانون کی رو سے ہر مسلمان مرد کا ہر مسلمان عورت سے نکاح ہو سکتا ہے۔ مگر ازدواجی زندگی کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ زوجین کے درمیان عادات، خصائل، طرزِ زندگی، خاندانی روایات اور معاشی و معاشرتی حالات میں زیادہ سے زیادہ مطابقت ہو تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اچھی طرح نباہ کر سکیں۔" (صفحہ ۹۹)

کسی زمانے میں جب مودودی صاحب کے سامنے حنفی فقہ کے ایسے مسائل آیا کرتے تھے تو وہ اس فقہ کی معتبر کتابوں یعنی کنز الدقائق، ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے (حقوق الزوجین۔ طبع ششم صفحہ ۹۸) لیکن اب ان کی سیاسی مصلحتیں اس کی متقاضی ہیں کہ ان کا نام لینے کے بجائے "بعض لوگ" کہہ کر آگے بڑھ جائیں۔

واقعہ معراج اور رویت باری تعالیٰ

معراج روحانی تھا یا جسمانی؟ اس بارے میں صحابہ کرام اور علمائے امت میں اختلاف رہا ہے۔ اگرچہ اکثر صحابہؓ اور تابعینؒ کا مسلک یہ ہے کہ معراج روح اور جسم دونوں پر طاری ہوا لیکن حضرت عائشہ رضؓ، حضرت حذیفہؓ بن الیمان، حضرت حسنؒ، حضرت امیر معاویہؓ، اور ابن اسحاق وغیرہم سے مروی ہے کہ یہ ایک روحانی معاملہ تھا۔ تاہم تفہیم القرآن جلد دوم میں صحابہ کرامؓ کے اس اختلاف کی طرف اشارہ کئے بغیر مودودی صاحب نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ جائے لئے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محض ایک روحانی تجربہ نہ تھا بلکہ ایک جسمانی سفر اور عینی مشاہدہ تھا۔ جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو کرایا۔ (صفحہ ۵۸۹)

لیکن اس جلد میں اپنے اس فیصلے کی کسی حد تک ترمیم کی کوشش کرتے ہیں۔ معراج کے واقعہ کی سب سے اہم خصوصیت حضور صلعم کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا بیان کی جاتی ہے جس کا مودودی صاحب اپنی تفسیر کی اس جلد میں انکار کرتے ہیں۔ اس طرح معراج کی حیثیت روحانی ہی رہ جاتی ہے۔ یہ ترمیم سورۃ النجم کی مندرجہ ذیل آیات کی تفسیر میں کی جاتی ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى۔ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى۔

اور ایک مرتبہ پھر اس نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اس کو دیکھا جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے اُس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چوندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

ان آیات کی تفسیر کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:-

یہ آیت اس امر کی تصریح کرتی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو نہیں بلکہ اس کی عظیم الشان آیات کو دیکھا تھا اور چونکہ سیاق و سباق کی رُو سے یہ دوسری ملاقات بھی اسی ہستی سے ہوئی تھی جس سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اس لئے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اُفق اعلےٰ پر جس کو آپ نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ بھی اللہ نہیں تھا اور دوسری مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جس کو دیکھا وہ بھی اللہ نہ تھا۔ (صفحہ ۲۰۱-۲۰۲)

اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس بارے میں زیادہ تر حضرت عائشہؓ سے روایت کردہ احادیث سے استدلال کرتے ہیں جو معراج کے جسمانی ہونے کی قائل تھیں۔ اس کے بعد ثابت کرتے ہیں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو نہیں بلکہ حضرت جبریلؑ کو دیکھا تھا۔ (صفحہ ۲۰۵)

اب قارئین خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جب معراج کے واقعہ سے اس کی سب سے اہم خصوصیت یعنی اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو خارج کر دیا جائے تو اس کی باقی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔

گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کا فرق

گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ میں فرق ان اہم مسائل سے ہے جن میں بہت سے اہل علم غلط بحث کر جاتے ہیں۔ یعنی بعض حضرات جس گناہ کو کبیرہ قرار دیتے ہیں دوسرے اسی کو صغیرہ کہتے ہیں اور صغیرہ کے متعلق شرعی حکم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایسے تمام گناہ وضو کرتے وقت دھل جاتے ہیں۔ مودودی صاحب بھی اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سورت النجم کی آیت اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ۔ (جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعا

سے پرہیز کرتے ہیں الا یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائے" کی تفسیر کے ذیل میں یہ فرق یوں واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ صغیرہ اور کبیرہ گناہوں میں فرق کیا ہے اور کس قسم کے گناہ صغیرہ اور کس قسم کے کبیرہ ہیں تو اس معاملے میں جس بات پر ہمارا اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ وہ فعل گناہِ کبیرہ ہے جسے کتاب و سنت کی کسی نصِ صریح نے حرام قرار دیا ہو یا اس کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ نے دنیا میں کوئی سزا مقرر کی ہو یا اس پر آخرت میں عذاب کی وعید سنائی ہو یا اس کے مرتکب پر لعنت کی ہو یا اس کے مرتکبین پر نزولِ عذاب کی خبر دی ہو۔ اس نوعیت کے گناہوں کے ماسوا جتنے افعال بھی شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہیں وہ سب صغائر کی تعریف میں آتے ہیں (ص ۲۱۲)

اس مسئلے کی وضاحت کے لئے ہم شریعتِ اسلامی کے سب سے بڑے سنگین گناہِ کبیرہ یعنی سود کو لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ قتلِ انسانی سے بھی زیادہ سنگین شمار ہوتا ہے اور اس بارے میں فرمانِ باری تعالیٰ یہ ہے کہ جو سود چھوڑنے پر تیار نہ ہو، وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو جائے۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ آیتِ ربٰو سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے اور ہمارے لئے آیتِ ربٰو کی تفصیل بیان نہ کی اس لئے سود اور جس چیز میں سود کا شبہ ہو اسے چھوڑ دو۔ تاہم بعض معاملات کے بارے میں حضور صلعم نے واضح طور پر فرمایا کہ یہ سودی معاملات ہیں اور ان ہی میں سے ایک زمین کی بٹائی ہے۔ (ملاحظہ ہو سنن ابو داؤد، مطبوعہ مصر، جلد ۳ - صفحہ ۳۵۵) ۔ دانشا بھی یہ سود ہی کی تعریف میں آتا ہے کہ اگر کسی صاحب کے بنک میں دس ہزار روپے جمع ہوں تو اس کا منافع بالاتفاق سود ہے اور جب اسی رقم کی اراضی خرید کر گھر بیٹھے بغیر محنت و مشقت کے مزارع کی آدھی محنت ہتھیا لی جائے جو بنک کے سود سے ہر لحاظ سے زیادہ ہوتی ہے تو کیا وہ سود کی تعریف سے خارج ہو جائے گی۔

اب اسلام کے اس سب سے سنگین گناہ کبیرہ کی طرف آیئے کہ جس کے بارے میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جس معاملے میں سود کا معمولی سا شبہ بھی ہو تو اس سے احتراز کرو۔ لیکن ہمارے مفکرِ شہیر والا معاملہ تو درکنار خود اس معاملے کو جسے حضور صلعم خود اپنی زبان مبارک سے سودی معاملہ قرار دے گئے ہیں یعنی زمین کی بٹائی، اسے عجیب غریب تاویلات کے ذریعے گناہِ کبیرہ کے ذیل سے نکال کر اکل حلال قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہمارے "مفکرین" نے گناہ کبیرہ کی تاویلات شروع کر دیں تو پھر شاید ہی کوئی گناہ کبیرہ قرار پا سکے۔

بغیر محنت کی کمائی یا سرمایہ داری نظام

سرمایہ داری نظام کی بنیاد یہ ہے کہ بغیر محنت کے دوسروں کی کمائی ہتھیا لی جائے۔ ایک عام فہم کا آدمی بھی یہی سمجھتا ہے کہ شریعت اسلامی بغیر محنت کی کمائی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی اور اس کے لئے قرآن مجید کی آیت وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں مگر وہ جو اس نے سعی کی ہے) سے استدلال کیا جاتا ہے۔ لیکن مودودی صاحب کا کمالِ فن ملاحظہ ہو کہ وہ اسی آیت سے سرمایہ داری نظام کا جواز پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

اس ارشاد سے بھی تین اہم اصول نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر شخص جو کچھ بھی پائے گا اپنے عمل کا پھل پائے گا۔ دوسرے یہ کہ ایک شخص کے عمل کا پھل دوسرا نہیں پا سکتا۔ اِلا یہ کہ اس عمل میں اس کا اپنا کوئی حصہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی شخص سعی و عمل کے بغیر کچھ نہیں پا سکتا۔

قارئین حیران ہوں گے کہ اس سادہ سے واضح حکم کی اتنی کھینچ تان کی کیا ضرورت تھی۔ ضرورت یہ تھی کہ مودودی صاحب چونکہ

اس سے سرمایہ داری کا جواز ثابت کرنا چاہتے ہیں اس لئے پہلے تو اس سادہ سی بات کو ملا کیا اور پھر اپنی مطلب کی بات یوں نکالی۔

ان تین اصولوں کو بعض لوگ دنیا کے معاشی معاملات پر غلط طریقے سے منطبق کر کے ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی محنت کی کمائی کے سوا کسی چیز کا جائز مالک نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ بات قرآن مجید ہی کے دیئے ہوئے متعدد قوانین اور احکام سے ٹکراتی ہے۔ مثلاً قانونِ وراثت، جس کی رُو سے ایک شخص کے ترکے میں بہت سے افراد حصہ پاتے ہیں اور اس کے جائز وارث قرار پاتے ہیں۔ درآں حالیکہ یہ میراث ان کی اپنی محنت کی کمائی نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک شیرخوار بچے کے متعلق تو کسی کھینچ تان سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں اس کی محنت کا بھی کوئی حصہ تھا۔ اسی طرح احکام زکوٰۃ و صدقات جن کی رُو سے ایک آدمی کا مال دوسروں کو محض اُن کے شرعی اور اخلاقی استحقاق کی بنا پر ملتا ہے اور وہ اس کے جائز مالک ہوتے ہیں حالانکہ اس مال کے پیدا کرنے میں ان کی محنت کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن کی کسی ایک آیت کو لے کر اس سے ایسے نتائج نکالنا جو خود قرآن ہی کی دوسری تعلیمات سے متصادم ہوتے ہوں، قرآن کے منشاء کے بالکل خلاف ہے (صفحہ ۶۱)

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ مودودی صاحب قانونِ وراثت اور نظامِ زکوٰۃ کی مثال سے بغیر محنت کی کمائی یعنی سرمایہ داری نظام کو جائز قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ اپنی کتاب "اسلام کے معاشی نظریات" میں وہ فرما چکے ہیں کہ زکوٰۃ کا نظام ایک قسم کا بیمہ کا نظام ہے کہ اگر زکوٰۃ دینے والا کبھی محتاج ہو جائے تو وہ اس سے اپنا حصہ پانے کا حقدار ہو جاتا ہے تو اس سے یہ کہاں جائز ہو جاتا ہے کہ بغیر محنت کے کسی دوسرے کی کمائی ہتھیالی جائے۔ اب رہا قانونِ وراثت تو میت کے رشتہ دار صرف اس کے مال سے حصہ ہی نہیں پاتے بلکہ زندگی اور موت میں اس کی ذمہ داریوں میں بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کی طرف سے دیت یعنی خون بہا دینے کی نوبت آئے تو یہی ورثہ پانے والے رشتہ دار اس ذمہ داری کو پورا کرتے ہیں۔ باقی رہا ورثہ، سو اس میں وارث، متوفی کی کمائی کو اس سے زبردستی نہیں چھینتے، اس کی رضامندی سے لیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی محنت کی کمائی ساری کی ساری خود صرف کر دے۔ یا (قرآن کے قانونِ وصیت کی رُو سے) اسے کسی دوسرے کو دے جائے، تو وارث اسے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ بات کہ متوفی کی کمائی اپنے ورثاء کے لئے چھوڑ گیا ہے اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ انہیں اپنی مرضی سے یہ کچھ دے گیا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں استحصال کرنے والا محنت کش کی کمائی اس کی رضامندی سے نہیں لیتا، اس سے جبراً چھینتا ہے۔ یہ فرق ہے نظامِ سرداری میں اور قرآن کے نظامِ صدقات و زکوٰۃ و وراثت میں۔ لیکن مودودی صاحب کو ایسے لطیف فرق میں جانے کی ضرورت کیا ہے۔ انہیں تو نظامِ سرمایہ داری کی تائید کرنا مقصود ہے خواہ اس کے لئے کچھ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

حُور کی مزید تفسیر

حورانِ جنت کی ایک تفسیر مودودی صاحب کی زبانی پچھلی قسط میں ہدیۂ قارئین کی جا چکی ہے۔ اس جلد میں وہ اس کی ایک اور تفسیر پیش کرتے ہیں۔ سورۃ الرحمٰن کی آیت ۵۶ — فِيهِنَّ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ۔ (ان نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جنہیں ان جنتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے چھوا نہ ہوگا) کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں خواہ کوئی عورت کنواری مر گئی ہو یا کسی کی بیوی رہ چکی ہو، جوان مری ہو یا بوڑھی ہو کر دنیا سے رخصت ہوئی ہو۔ آخرت میں جب یہ سب نیک خواتین جنت میں داخل ہوں گی۔

نوجوان اور کنواری بنادی جائیں گی اور وہاں ان میں جس خاتون کو بھی کسی نیک مرد کی رفیقۂ حیات بنایا جائے گا، وہ جنت میں اپنے اس شوہر سے پہلے کسی کے تصرف میں آئی ہوئی نہ ہوگی۔ (صفحہ ۲۶۸)

مودودی صاحب کی زبانی حور کی جو تفسیر پچھلی قسط میں گزر چکی ہے وہ اس تفسیر سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حوریں اہل جنت کی بیویوں کے علاوہ ہوں گی۔ بالکل ٹھیک اسی طرح جس طرح اس دنیا میں منکوحہ بیویوں کے ساتھ وہ بے حد و حساب لونڈیوں کی اجازت دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک دو صفحات آگے چل کر وہ ہمارے خیال کی تائید بھی کرتے ہیں جب حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ (خیموں میں ٹھیرائی ہوئی عورتیں) کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

خیموں سے مراد غالباً اس طرح کے خیمے ہیں جیسے امراء و رؤساء کے لئے سیرگاہوں میں لگائے جاتے ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ اہل جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں میں رہیں گی اور ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے[1] جن میں حوریں اُن کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔ ہمارے اس قیاس کی بنا یہ ہے کہ پہلے خوب سیرت اور خوبصورت بیویوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد اب حوروں کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ ان بیویوں سے مختلف قسم کی خواتین ہوں گی[2] (صفحہ ۲۷۱)

دولت کی گردش پورے معاشرہ میں عام ہو

اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں سورت الحشر کی مشہور آیت کی لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

یہ قرآن مجید کی اہم ترین اصولی آیات میں سے ہے جس میں اسلامی معاشرے اور حکومت کی معاشی پالیسی کا یہ بنیادی قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ دولت کی گردش پورے معاشرے میں عام ہونی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ مال صرف مالداروں ہی میں گھومتا رہے یا امیر روز بروز امیر تر اور غریب روز بروز غریب تر ہوتے چلے جائیں۔ .... یہ کھلا ہوا اشارہ اس طرف ہے کہ ایک اسلامی حکومت کو اپنی آمد و خرچ کا نظام اور بحیثیت مجموعی ملک کے تمام مالی اور معاشی معاملات کا انتظام اس طرح کرنا چاہیئے کہ دولت کے ذرائع پر مالدار اور با اثر لوگوں کی اجارہ داری قائم نہ ہو اور دولت کا بہاؤ نہ غریبوں سے امیروں کی طرف ہونے پائے نہ وہ امیروں ہی میں چکر لگاتی رہے۔

(صفحہ ۳۹۳)

ادھر مودودی صاحب یہ فرماتے ہیں اور دوسری طرف یہ فتوے دیتے ہیں کہ:۔

اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو، جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عاید کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ

---

[1] یعنی جب وہ پکنک منانے جائیں گے تو وہاں یہ عورتیں سپلائی کی جائیں گی۔ (معاذ اللہ)

[2] استغفر اللہ۔ استغفر اللہ۔ جب جنسی جذبات کسی کے اعصاب پر سوار ہوں تو عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے اور اسے اس کا کچھ ہوش نہیں رہتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اس کے نشتر کی زد کہاں تک پہنچ رہی ہے!

اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے کبھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ (مسئلہ ملکیت زمین صفحہ ۱۰۹)

آپ سوچئے کہ اگر سرمایہ داروں کو بے حد وحساب ملکیت کی اجازت دیدی جائے تو پھر دولت کا بہاؤ غریبوں کی طرف کس طرح ہوگا اور اسلامی معاشیات کے اس بنیادی قاعدے پر کس طرح عمل ہوگا ؟

مفتوحہ ممالک مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہیں

مودودی صاحب تفہیم القرآن کی اس جلد میں ایک ایسی حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر وہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے پہلے اس کا اعلان کر دیتے تو جماعت اسلامی کو ان انتخابات میں شاید اتنی بڑی شکست نہ ہوتی۔ سورۃ الحشر کی آیت وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ (اور وہ ان لوگوں کے لئے بھی ہے جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے تمام مفتوحہ ممالک کی زمینوں کو جس میں برصغیر ہند و پاک بھی شامل تھا مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیتے ہیں۔ انہی کے الفاظ میں سنیئے :۔

> اس فیصلے کے مطابق اراضی مفتوحہ کی اصل حیثیت یہ قرار پائی کہ مسلم ملت بحیثیت مجموعی ان کی مالک ہے۔ جو لوگ پہلے سے ان زمینوں پر کام کر رہے تھے ان کو ملت نے اپنی طرف سے بطور کاشتکار برقرار رکھا ہے وہ ان اراضی پر اسلامی حکومت کو ایک مقرر لگان ادا کرتے رہیں گے۔ نسلاً بعد نسلٍ یہ کاشتکارانہ حقوق ان کی میراث میں منتقل ہوتے رہیں گے اور وہ ان حقوق کو فروخت بھی کر سکیں گے۔ مگر زمین کے اصل مالک وہ نہ ہوں گے بلکہ مسلم ملت ان کی مالک ہوگی۔[1] (صفحہ ۴۰۰)

اراضی پاکستان بھی انہیں مفتوحہ ممالک کے ذیل میں آتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد شروع شروع میں تو ہمارے علماء اس بارے میں خاموش رہے لیکن جب ان کی اپنی ضروریات متقاضی ہوئیں تو انہوں نے اسلاف کے ان فتاویٰ کا حوالہ دیا کہ جن کے تحت برصغیر کی اراضیات اسلامی بیت المال کی ملکیت قرار پائی تھیں اور کہا کہ پاکستان کی اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی ان کی پہلی شرعی حیثیت لوٹ آتی ہے (ملاحظہ ہو "اسلام کا نظام اراضی" از مفتی محمد شفیع صاحب، مطبوعہ کراچی، صفحہ ۹۶، ۹۷)

اب جب پاکستان کی تمام اراضیات مفتوحہ ممالک کے ذیل میں آکر حکومت پاکستان کی ملکیت قرار پاتی ہیں تو پھر یہاں پر بے حد وحساب ملکیت یا ملکیت کی کسی حد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن مودودی صاحب ایک طرف پاکستان کی اراضی کے متعلق یہ فیصلہ بھی دیتے ہیں اور دوسری طرف اپنی دو سالہ پرانی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" کے تازہ ایڈیشن بھی شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مسلک ہی یہ ہے کہ سیاسی ترکش میں ہر قسم کا تیر رکھنا چاہیئے۔

مرتد عورت کا نکاح نہیں ٹوٹتا

وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رکھو) کی تفسیر کے ذیل آیت کے

---

[1] قرآن کی رو سے مفتوحہ اور غیر مفتوحہ اراضی میں کوئی فرق نہیں۔ زمین (وہ کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو) امت کی مشترکہ تحویل میں رہتی ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی۔ (طلوع اسلام)

منشاء کے خلاف لکھتے ہیں:۔

> اور اگر عورت مرتد ہو گئی ہو تو حنفیہ کا قدیمی فتویٰ یہ تھا کہ اس صورت میں بھی نکاح فوراً فسخ ہو جائے گا۔ لیکن بعد کے دور میں علمائے بلخ و سمرقند نے یہ فتویٰ دیا کہ عورت کے مرتد ہونے سے فوراً فرقت واقع نہیں ہوتی۔ اور اس سے ان کا مقصد اس امر کی روک تھام کرنا تھا کہ شوہروں سے پیچھا چھڑانے کے لئے عورتیں کہیں ارتداد کا راستہ اختیار نہ کرنے لگیں۔ مالکیہ کا فتوےٰ بھی اِس سے ملتا جلتا ہے۔ (صفحہ ۳۴۴)

مودودی صاحب نے اپنی کتاب "مرتد کی سزا" (صفحہ ۱۶ اور ۱۷) پر کئی ایسی روایات نقل کی ہیں کہ حضور صلعم نے مرتد عورتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا اور پھر انہی روایات سے وہ مرتد مردوں کے قتل پر استدلال کرتے ہیں۔ کہاں اتنی سختی کہ مرتد کو قتل کیا جا رہا ہے۔ اور کہاں اتنی نرمی کہ قرآن مجید کے واضح حکم کے خلاف مرتد عورت کا نکاح بھی نہیں ٹوٹنے دیتے۔ کیا بات ہے ہمارے اس مفسر کی!

اسقاطِ حمل بھی قتلِ اولاد میں شامل ہے

سورۃ الممتحنہ کی آیت وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ (اور وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے) کے حاشیے میں لکھتے ہیں کہ اس میں اسقاطِ حمل بھی شامل ہے خواہ وہ جائز حمل کا اسقاط ہو یا ناجائز حمل کا (صفحہ ۴۴۴) فقہاء نے حمل کے مختلف درجوں میں فرق کیا ہے اور جب تک جنین میں روح نہ پڑ جائے وہ اس کے اسقاط میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے اور ایسا ان کے نزدیک اکیسویں دن کے بعد ہوتا ہے۔ (فتاویٰ شامی، جلد ۲ صفحہ ۴۱۲)۔ اس سے پہلے وہ اسے نطفہ ہی شمار کرتے ہیں اور جس طرح ضبطِ ولادت کے لئے نطفہ کے ضائع کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح روح پڑنے سے پہلے اسقاطِ حمل میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ لیکن مودودی صاحب اس اہم فرق کو نظر انداز کر کے اسے قتلِ اولاد قرار دیتے ہیں۔

لفظ اُمّی کی مزید تفسیریں

لفظ اُمّی کی ایک تفسیر تفہیم القرآن جلد سوم کے تبصرے میں گذر چکی ہے جس میں نبی الاُمّی کے غلط تصور کی وجہ سے نعوذ باللہ حضور صلعم کو ان پڑھ ثابت کیا جاتا ہے۔ لفظ اُمّی کی تحقیق ہم نے اپنی جانب سے پیش کی تھی۔ لیکن چونکہ مودودی صاحب کے سامنے اس لفظ کا اصل مفہوم نہیں ہے، اس لئے وہ بیچارے اس بارے میں بھٹکتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اور کہیں اس کے معنی کچھ کرتے ہیں اور کہیں کچھ۔ چنانچہ سورۃ الجمعہ کی آیت هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ۔ (وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود انہی سے اٹھایا) میں اس لفظ کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں:۔

> معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآن مجید میں اُمّی کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے اور سب جگہ اس کے معنی ایک ہی نہیں ہیں بلکہ مختلف مواقع پر وہ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں وہ اہلِ کتاب کے مقابلہ میں ان لوگوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں ہے جس کی پیروی وہ کرتے ہیں۔ مثلاً فرمایا، قُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ (آلِ عمران ۔ ۲۰) اہلِ کتاب اور امیوں سے پوچھو کیا تم نے اسلام قبول کیا؟ یہاں امیوں سے مراد مشرکینِ عرب ہیں، اور ان کو اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے الگ ایک گروہ قرار دیا گیا ہے۔ کسی جگہ یہ لفظ خود اہلِ کتاب کے ان پڑھ اور کتاب اللہ سے

ناواقف لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جیسے فرمایا۔ وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ ۔ (البقرہ۔ ۷۸) ان یہودیوں میں کچھ لوگ اُمّی ہیں۔ کتاب کا علم نہیں رکھتے۔ بس اپنی آرزوؤں ہی کو جانتے ہیں، اور کسی جگہ یہ لفظ خالص یہودی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے جس سے مراد دنیا کے تمام غیر یہودی ہیں۔" (صفحہ ۸۶-۴۸۵)

مودودی صاحب کے سامنے اگر لفظ اُمّی کی وہ تشریح ہوتی جسے ہم ان کی تفہیم القرآن جلد سوم کے تبصرے میں پیش کر چکے ہیں اور جس کی رُو سے عربی گرامر کے قاعدے کے مطابق امیین کے معنی بنی اسمٰعیل کے بنتے ہیں تو نہ انہیں حضور صلعم کو اَن پڑھ قرار دینے کی ضرورت پڑتی اور نہ ہی مختلف مواقعوں پر اس کے مختلف معانی کرنے پڑتے۔ بلکہ ہر جگہ اس کے ایک ہی معنی ہوتے جن کی عربی قواعد میں پوری پوری گنجائش ہے۔

اسلامی ریاست میں خدا اور رسولؐ کے احکام کی مخالفت واجب القتل جرم ہے

مودودی صاحب نے یہ رائے بھی

اندکس میں قائم کی ہے (صفحہ ۵۰۷) لیکن تفسیر میں یہ شرعی حکم کسی آیت کے ذیل میں بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ سورت المنافقون کے دیباچہ میں مشہور منافق مدینہ ابن اُبی کا وہ طرزِ عمل نقل کیا ہے کہ جب دو مسلمانوں میں جھگڑا ہوا تو اس نے جاہلیت کے نام پر اس جھگڑے کو بڑھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس واقعہ کی تفاصیل نقل کرنے کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جو طرزِ عمل ابن اُبی نے اختیار کیا تھا اگر کوئی شخص مسلم ملت میں رہتے ہوئے اُس طرح کا رویہ اختیار کرے تو وہ قتل کا مستحق ہے۔ (صفحہ ۵۱۰) اتنے بڑے شرعی فیصلے کے لئے انہوں نے قرآن و سنت سے کوئی دلیل نہیں دی۔ ان کے اس خودساختہ شرعی حکم کی تردید کے لئے اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ ابن اُبی کو قتل نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ اپنی طبعی موت مرا تھا۔

واضح رہے کہ مملکت کے خلاف بغاوت اور چیز ہے اور حکومت کے کسی قانون کی خلاف ورزی اور شے۔ جرم بغاوت کی سزا موت ہے لیکن کسی قانون کی خلاف ورزی کی سزا وہ ہے جو اس قانون کی رُو سے مقرر کی گئی ہو۔ مودودی صاحب "خدا اور رسولؐ کے کسی حکم کی مخالفت" کی سزا موت اس لئے تجویز کرتے ہیں کہ جب اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھوں میں آئے تو وہ اپنے مخالفوں کو ٹھکانے لگا سکیں اور اتنا نہیں سوچتے کہ اگر اس تلوار کو اس طرح بے نیام کر دیا جائے تو پھر کسی کا سر بھی محفوظ نہیں رہ سکیگا۔ خود مودودی صاحب کے ایسے بے شمار فیصلے سامنے لائے جا سکتے ہیں جو خدا اور رسولؐ کے حکم کے صریحاً خلاف ہیں۔ اس سلسلے میں ہم سردست صرف وہ ایک مثال پیش کرتے ہیں جو اسی جلد میں چند صفحات آگے جا کر ہمیں ملتی ہے جہاں مودودی صاحب علی الاعلان خدا اور رسول کے احکام کی مخالفت کر کے اس مسلک کو اختیار کرتے ہیں جسے وہ خود بدعت قرار دیتے ہیں۔

یکبارگی تین طلاقوں کی ممانعت

سورۃ الطلاق کی پہلی آیت يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ۔ (اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے لئے طلاق دیا کرو) کی تفسیر یوں بیان فرماتے ہیں۔

اس آیت کے منشا پر مزید روشنی چند اور احادیث بھی ڈالتی ہیں۔ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ سے منقول ہیں۔ نسائی میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ

ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالی ہیں۔ حضورؐ یہ سنکر غصے میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا اَیُلْعَبُ بِکِتَابِ اللّٰہِ وَ اَنَا بَیْنَ اَظْھُرِکُمْ۔ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جا رہا ہے حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ اس حرکت پر حضورؐ کے غصے کی کیفیت دیکھ کر ایک شخص نے پوچھا۔ کیا میں اسے قتل نہ کر دوں؟ (صفحہ ۵۵۵)

لیکن مسلمانوں کے دورِ ملوکیت میں جب اربابِ اقتدار کے مفاد کا تقاضا ہوا تو طلاق کے اسی خلافِ قرآن و سنت طریقے کا وسیع پیمانے پر رواج ہو گیا اور آج تک چلا آ رہا ہے۔ یہاں تک کہ عامۃ الناس اس کے سوا طلاق کا دوسرا طریقہ جانتے ہی نہیں۔ اس غلط طریق نے ہمارے اکثر گھرانوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے جس سے متاثر ہو کر مودودی صاحب نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ "ان خرابیوں کا سدِباب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینے پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کر سکیں۔" (حقوق الزوجین، طبع ششم صفحہ [illegible])

یہاں تک تو مولانا خدا اور رسولؐ کے احکامات کے مطابق چلتے ہیں۔ لیکن جب حکومتِ پاکستان نے مودودی صاحب کی تجویز کے مطابق اس طلاقِ بدعت کے خاتمے کے لئے پابندیاں عائد کیں تو معلوم نہیں کہ مودودی صاحب کی فکر میں کون سا انقلاب آ گیا کہ انہوں نے طلاق کے اس طریقے کی، جو خدا اور رسولؐ کے احکامات کے مطابق تھا، مخالفت کرنی شروع کر دی۔ اور ان احکامات کے خلاف اس طلاقِ بدعت کو دوبارہ رائج کرنے کی تحریک شروع کر دی جسے سن کر حضورؐ غصے سے کھڑے ہو گئے تھے۔ بہتر ہو گا کہ ہم ان کی اس انقلابی فکر کو انہی کے الفاظ میں نقل کر دیں۔

> بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب کے نزدیک درست ہے لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے۔ حنفی مذہب میں اگر تین طلاق بیک وقت دیئے گئے ہوں تو اس سے طلاقِ مغلظہ واقع ہو جاتی ہے اور مطلقہ عورت سے اس کا سابق شوہر نہ تو مدتِ عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدت گزر جانے کے بعد اس کے ساتھ پھر نکاح کر سکتا ہے، جب تک اس کی تحلیل نہ ہو جائے۔ اس ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے۔ ان حنفی باشندوں کو جو اعتماد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور مذہبِ حنفی کے ائمہ و فقہاء کے علم و تقویٰ پر ہے وہ اعتماد آجکل کے قانون سازوں پر نہیں ہے۔

(عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات - صفحہ ۱۸، ۱۹)

ہماری سمجھ میں یہ بات ابھی تک نہیں آ سکی کہ طلاق کا جو طریقہ خدا اور رسولؐ کے احکامات کے خلاف ہے وہ جائز کس طرح قرار پا سکتا ہے۔ مودودی صاحب سے کئی دفعہ اس کی وضاحت کی درخواست کی جا چکی ہے لیکن ابھی تک ہم انکی وضاحت سے محروم ہیں۔ یہاں ہم نے یہ دکھانا تھا کہ پچھلے عنوان میں مودودی صاحب جو یہ شرعی مسئلہ مستنبط کرنا چاہتے تھے کہ اسلامی ریاست میں خدا اور رسول کے احکام کی مخالفت واجب القتل جرم ہے تو اس کے مرتکب تو وہ خود بدرجۂ اولیٰ ہو رہے ہیں کہ جس چیز کو وہ ساری زندگی دلائل سے خدا اور رسولؐ کے احکامات کے مطابق ثابت کرتے رہے، آخری عمر میں اس کی مخالفت میں اس حد تک پہنچ گئے کہ اس کے خاتمے کے لئے انہیں ایک سرگرم تحریک چلانی پڑی۔

سازشی نکاح کا جواز

اگر طلاق خدا اور رسولؐ کے احکامات کے مطابق دی جائے تو پھر تو میاں بیوی میں رجوع کی گنجائش باقی رہتی ہے اور لاکھوں گھرانے تباہ ہونے سے بچ جاتے ہیں۔

لیکن اگر ان احکامات کے خلاف صرف طلاق بدعت مروج ہو تو نہ تو ان لاکھوں گھرانوں کو تباہی سے بچایا جاسکتا ہے اور نہ ہی زوجین کی پشیمانی کے بعد ان میں رجوع کی صورت باقی رہتی ہے۔ مودودی صاحب سورۃ الطلاق کی پہلی آیت ہی کے ذیل میں اسے یوں بیان کرتے ہیں:۔

> طلاقِ سنت اور طلاقِ بدعت کے نتائج کا فرق یہ ہے کہ ایک طلاق یا دو طلاق دینے کی صورت میں اگر عدت گذر بھی جائے تو مطلقہ عورت اور اس کے سابق شوہر کے درمیان باہمی رضامندی سے پھر نکاح ہو سکتا ہے لیکن آدمی اگر تین طلاق دے چکا ہو تو نہ عدت کے اندر رجوع ممکن ہے نہ عدت گذر جانے کے بعد دوبارہ نکاح کیا جاسکتا ہے۔ الا یہ کہ اس عورت کا نکاح کسی اور شخص سے ہو۔ وہ نکاح صحیح نوعیت کا ہو۔ دوسرا شوہر اس سے مباشرت بھی کرچکا ہو پھر یا تو وہ اسے طلاق دے دے یا مرجائے۔ اس کے بعد اگر عورت اور اس کا سابق شوہر باہمی رضامندی کے ساتھ ازسرِ نو نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ (صفحہ ۵۶۲)

اصطلاح میں اس طریقے کو تحلیل کہتے ہیں اور جو عوام میں "حلالہ" کے نام سے مشہور ہے۔ مودودی صاحب اسے سازشی نکاح کا نام دیتے ہیں۔ اس نکاح کے متعلق حنفی فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں:۔

> "واذا تزوجها بشرطِ التحليل فالنكاحُ مكروهٌ لِقولهِ عليه السلام لعن الله المحلّل و المحلّل له وهذا هو محمله فان طلقها بعد وطيها حلت للاول لوجود الدخول في النكاح صحيح۔ (ہدایہ اولین عیدی۔ صفحہ ۳۶۷)
>
> (ترجمہ) اگر حلالہ کی شرط سے کسی عورت سے نکاح کیا تو یہ مکروہ عمل ہے کیونکہ حضور صلعم نے حلالہ کرنے اور کرانے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجی ہے اور اس سے مراد یہی حلالہ ہے۔ تاہم اگر اس (سازشی نکاح) کے بعد کوئی شخص عورت سے مباشرت کے بعد اسے طلاق دے دے تو پہلے طلاق دینے والے شخص کے لئے حلال ہو جائے گی کیونکہ دخول نکاح صحیح میں ہوا ہے۔

چونکہ حنفی فقہا کا واسطہ دے کر مودودی صاحب اس طلاق بدعت کو دوبارہ رائج کرانا چاہتے ہیں جو خود ان کی اپنی تحقیق کے مطابق خدا اور رسولؐ کے احکامات کے خلاف ہے اس لئے وہ اس سازشی نکاح کی مذمت بھی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اسے جائز بھی قرار دیتے ہیں۔ ان کا حیلہ انہی کی زبانی سنیئے۔

> رہا سازشی نکاح جس میں پہلے سے یہ طے شدہ ہو کہ عورت کو سابق شوہر کے لئے حلال کرنے کی خاطر ایک آدمی اس سے نکاح کرلے گا اور مباشرت کرنے کے بعد اسے طلاق دے دیگا تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ نکاح فاسد ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس سے تحلیل تو ہو جائے گی مگر یہ فعل مکروہِ تحریمی ہے۔"
>
> (صفحہ ۵۶۳)

حنفی فقہ سے ہم سازشی نکاح کا جواز نقل کر آئے ہیں وہاں امام ابو حنیفہؒ کا نام نہیں ہے لیکن مودودی صاحب یہ بھی انہی کے ذمہ لگاتے ہوئے سازشی نکاح کو جائز قرار دیتے ہیں۔

نابالغ لڑکی سے نکاح اور مباشرت کا قرآنی جواز

ہمارے معاشرے میں صغر سنی کی شادیوں سے جو مفاسد پیدا ہوتے ہیں انہیں دیکھئے

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

باسمہٖ تعالیٰ

با غلام خویش بر یک خواں نشست

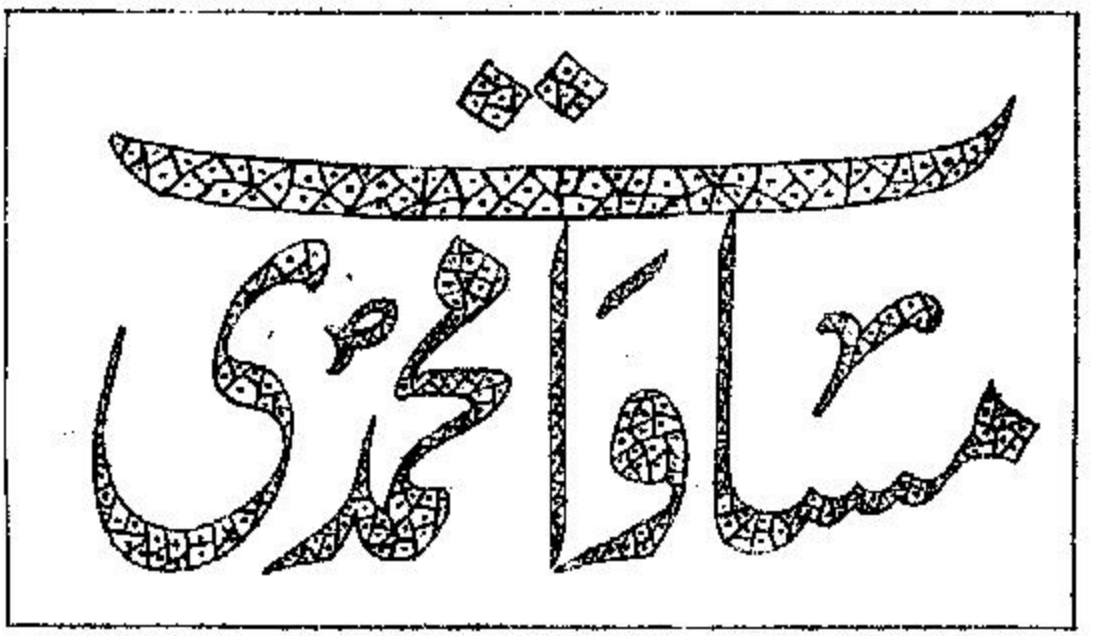

مساواتِ محمدیؐ

بتقریب سعید عید میلاد النبیؐ (منعقدہ ۱۵ اپریل ۱۹۷۳ء

پرویز صاحب کا دل گداز و بصیرت افروز

خطاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مساواتِ محمدیؐ

قوتِ او ہر کہن پیکر شکست ٭ نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید ٭ بندہ را باز از خداونداں خرید

عزیزانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت!

جیسا کہ ہم میں سے ہر ایک کو علم ہے قرآن کریم کا آغاز ان چار الفاظ سے ہوتا ہے۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی ذات سزاوار حمدیت اس لئے ہے کہ اس نے کائنات کی ربوبیت کا انتظام کر رکھا ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے پرورش کرتے ہوئے بتدریج 'مقامِ تکمیل تک پہنچا دینا۔ علمائے سائنس بتاتے ہیں کہ کرۂ ارض بہت پہلے وجود میں آگیا تھا۔ اور اس پر زندگی کی نمود بعد میں جا کر ہوئی تھی۔ لیکن جب اس پر زندگی کی نمود ہوئی تو جن عناصر پر زندگی کا دار و مدار تھا وہ صفحۂ ارض پر پہلے سے موجود تھے۔ زندگی اپنے نقطۂ آغاز سے ارتقائی منازل طے کرتی چلی آئی اور ہر مقام پر اسے اس کے مناسب حال' سامانِ نشو و نما ملتا چلا گیا۔ انسان سے پہلے زندگی محض طبیعی (PHYSICAL) تھی۔ اس لئے اس کی نشو و نما کا سامان بھی صرف طبیعی تھا۔ لیکن پیکرِ انسانیت میں پہنچ کر زندگی محض طبیعی نہ رہی۔ اس نے ایک اور منزل میں بھی اپنا ابتدائی قدم رکھا' جسے بغرض تعارف "انسانی زندگی" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان کو اپنی طبیعی زندگی کے لئے بہرحال طبیعی سامانِ نشو و نما کی ضرورت تھی۔ (اس باب میں اس میں اور دیگر حیوانات میں کوئی فرق نہ تھا) لیکن اس کی انسانی زندگی کو اپنی نشو و ارتقاء کے لئے مستقل اقدار کی ضرورت تھی جو اسے وحی کے ذریعے عطا ہوئیں۔ یہ وحی خدا کی طرف سے حروف و الفاظ کی شکل میں نازل ہوتی تھی۔ اگر انسانی راہنمائی کے لئے صرف الفاظ و نقوش کافی ہوتے تو خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ وہ وحی پر مشتمل ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے اتار دیتا۔ یا ان الفاظ کو کسی پہاڑ کی چٹان پر کندہ کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اپنی وحی کو منتخب افراد کے ذریعے نوعِ انسان تک پہنچایا (جنہیں رسول کہا جاتا ہے) اور ان سے کہہ دیا کہ وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائیں بھی اور اس پر عمل کر کے بھی دکھائیں تا کہ ان کا یہ عمل' دوسروں کے لئے نمونہ کا کام دے۔

قرآن اور صاحبِ قرآن

خدا کی یہ وحی اپنی آخری' مکمل اور غیر متبدل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اور صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کا اس پر عمل جسے خدا نے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) کہہ کر پکارا ہے زمانے کے ریگِ رواں پر تابندہ موتیوں کی طرح منقوش۔ قرآن کی تعلیم'

اور اس کے مطابق صاحبِ قرآن کا عمل (جو اصولی طور پر خود قرآن کے اندر محفوظ ہے) انسانی زندگی کو اس کے نصب العین تک پہنچانے کے لئے مکمل راہ نمائی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے میں نے اپنی کتاب 'معراجِ انسانیت' میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کے لئے جو قوانین دیئے جانے مطلوب تھے وہ انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ
>
> مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
>
> بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو
>
> (ص ۵ - ۱۹۴۸ء ایڈیشن)

آج کا یہ مبارک و مسعود اجتماع انہی درخشندہ نقوش کی تابانیوں سے اپنی نگہ بصیرت کو جلا بخشنے کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔ یہ واضح ہے کہ جس طرح انسانی زندگی کے متنوع پہلو ہیں، اسی طرح اس شارحِ اسرارِ حیات کے اسوۂ حسنہ کے بھی متعدد گوشے ہیں۔ آج کے اجتماع میں، میں ان میں سے صرف ایک گوشے کو پیشِ خدمت کر سکوں گا جسے (جیسا کہ آپ نے اعلان میں دیکھ لیا ہوگا) مساواتِ محمدی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ میں نے اس موقع پر خاص طور پر اس موضوع کو کیوں منتخب کیا ہے، اس کے متعلق ذرا آگے چل کر وضاحت کی جائے گی، لیکن وہاں تک پہنچنے سے پہلے چند الفاظ بطورِ تمہید عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

دین اور مذہب

خدا کی طرف سے انسانوں کو دین ملتا ہے۔ لیکن انسانی خیالات کی آمیزش اسے مذہب کی پست سطح پر لے آتی ہے۔ اس سے اشتباہ نہیں ہوتا کہ دین نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس سے قوم بہت بڑے فریب کا شکار ہو جاتی ہے۔ مذہب، دین کے الفاظ اور اصطلاحات کو برقرار رکھتا ہے لیکن ان کے معانی مسخ کر کے ان کا مفہوم بدل دیتا ہے۔ وہ دین کے ارکان و شعائر کی شکل و صورت علیٰ حالہ قائم رکھتا ہے لیکن ان کی روح نکال دیتا ہے۔ قوم، دین کی ان ممی شدہ لاشوں کو زندہ اور زندگی بخش پیکر سمجھ کر ان کی پرستش کرتی اور اس فریب میں مبتلا رہتی ہے کہ ہم دین کا مقصد پورا کر رہے ہیں۔ مذہب وہ گوسالۂ سامری ہوتا ہے جسے مفاد پرست گروہ تراش کر، قوم کے ذوقِ عبودیت کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ وہ اس سے قوم کو نہ صرف اس فریب میں مبتلا کرتا ہے بلکہ اس کی گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں (بدقسمتی سے) جو کچھ اسلام کے نام پر کہا اور کیا جاتا ہے وہ اسی فریبِ قلب اور طلسمِ نگاہ کا مظہر ہے۔ یہ وہ غیر اسلامی تصورات و نظریات اور بے جان مناسک و مشارب ہیں جن کے ساتھ لفظ اسلام کا لیبل چپکا کر انہیں عین دین بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے زمانے میں ان اصطلاحات میں چند ایک کا اضافہ ہوا ہے۔ ان میں سے ایک اصطلاح "اسلامی سوشلزم" ہے۔

اسلامی سوشلزم

ہمارا دور "عصرِ معاشیات" (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے جس میں اس معاشی نظام کو خاص شہرت حاصل ہے جو مارکس کی فکری تخلیق ہے (یا یوں کہیئے کہ اس نے اس کا احیاء کیا ہے)۔ اس نظام کی ابتدائی شکل کو سوشلزم اور انتہائی اسٹیج کو کمیونزم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مارکس

انسانی زندگی کو محض طبیعی زندگی قرار دیتا ہے اور اس انسانی سطح زندگی کا نہ صرف منکر ہے بلکہ اس کا شدید ترین دشمن، جس کی نشوونما وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کی رُو سے ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے سامنے قرآن کا معاشی نظام ہے، نیں جو نظام سرمایہ داری کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اس کے برعکس ان کے مذہبی پیشوا اس سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کو اسلامی نظام کہہ کر پیش کرتے ہیں جو ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ ہے۔ یہ نظام جسدِ انسانیت کے لئے جذام اور شرفِ آدمیت کے لئے پیغامِ موت ہے۔ قوم کا حساس طبقہ اس نظام سے ابا کرتا ہے لیکن دوسری طرف سے اس کے سامنے جو نظام (سوشلزم) آتا ہے وہ وحی اور رسالت کے انکار پر مبنی ہے اس لئے وہ اسے بھی بطیبِ خاطر قبول نہیں کر سکتا۔ اس کشاکش کا علاج یہ سوچا گیا کہ اس کا نام سوشلزم کے بجائے اسلامی سوشلزم رکھ دیا جائے۔ میں چونکہ اس موضوع پر اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکا ہوں اس لئے اس مقام پر اسے دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ زیادہ نہیں تو کم از کم میرا وہ خطاب دیکھ لیں جسے میں نے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اپریل ۱۹۷۱ء میں پیش کیا تھا اور جو پمفلٹ کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

مساواتِ محمدیؐ

اس وقت میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ان حضرات سے پوچھئے کہ سوشلزم اور اسلامی سوشلزم میں فرق کیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکیں گے۔ اس پریشانیٔ فکر و نظر سے گھبرا کر اب اس کے لئے ایک اور اصطلاح اختیار کی گئی ہے اور وہ ہے مساواتِ محمدیؐ لیکن جس طرح انہوں نے "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کو مبہم رکھنے میں عافیت سمجھی تھی اسی طرح وہ اب اس جدید اصطلاح ـــ مساواتِ محمدیؐ ـــ کی بھی وضاحت نہیں کرتے اور یہ نہیں بتاتے کہ اس سے ان کا مفہوم کیا ہے۔ مساواتِ محمدیؐ کی اصطلاح بڑی مقدس اور عظیم ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہی دین کا منتہیٰ و مقصود اور اسلام کا ما حصل ہے۔ یہ انسانی زندگی کا ایسا بلند تصور ہے جس کی نظیر فکرِ انسانی پیش نہیں کر سکتا۔ جو معاشرہ مساواتِ محمدیؐ کی بنیادوں پر متشکل ہو اسے قرآن جنتی زندگی کہہ کر پکارتا ہے جو مقامِ آدم کا سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ اسے سوشلزم کا مرادف اور ہم عنان قرار دے دینا اور "روٹی" کی سطح پر لے آنا پیامِ محمدیؐ تو ایک طرف خود شرفِ انسانیت کی اتنی بڑی توہین و تذلیل ہے جسے کوئی دیدہ ورِ قلبِ حساس برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ انسان کو حیوان بنا دینے کے مرادف ہے۔ علامہ اقبالؒ نے مارکسی نظریہ معیشت کے متعلق کہا تھا کہ

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ اب اسی "پیغمبرِ حق ناشناس" کے دین کو دینِ خداوندی کا لیبل لگا کر پیش کیا جاتا اور مساواتِ محمدیؐ کا حسین و جمیل نقاب اوڑھا کر منظرِ عام پر لایا جاتا ہے۔ میں اس مختصر سے وقت میں گزارش کروں گا کہ مساواتِ محمدیؐ کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔

اسلام سے پہلے

اگر کوئی پوچھے کہ قرآن کریم نے انسان کو وہ کون سی متاعِ عظیم عطا کی ہے جس سے وہ محروم چلا آ رہا تھا اور جس کے ملنے کی اور کوئی شکل نہیں تھی، تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کرا دیا۔ ظہورِ اسلام کے وقت ہندومت، یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت، عالمِ انسانیت کے مشہور مذاہب تھے۔ ہندومت کا عقیدہ تھا کہ پیدائش کے اعتبار سے انسان چار ورنوں یا طبقوں میں تقسیم

ہوتے ہیں۔ برہمن برہما کے سر سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں باقی تمام انسانوں پر حقِ حکومت حاصل ہوتا ہے۔ کھشتری اس کے بازوؤں سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے وہ ملک کا دفاع کرتے ہیں۔ ویش اس کے پیٹ سے جنم لیتے ہیں اس لئے روزی پیدا کرنا ان کا فریضہ ہوتا ہے۔ اور شودر' برہما کے پاؤں کی میل ہوتے ہیں۔ وہ اونچی ذات والوں کی خدمت کے لئے دنیا میں بھیجے جاتے ہیں۔ ورنوں کی یہ پیدائشی تقسیم اور اس کی رُو سے ہر انسان کے مقام کا تعین پہلے سے مقدر اور ناقابلِ تغیر و تبدل سمجھا جاتا تھا۔ اس تفریقِ مدارج کی شدت کا یہ عالم تھا کہ جس سڑک پر برہمن چلتے تھے اس پر کسی شودر کو پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ جو چاول برہمن کھاتے تھے شودر ان کا ایک دانہ بھی نہیں چکھ سکتا تھا۔ حتیٰ کہ رگوید میں یہاں تک کہا گیا تھا کہ،

> اگر کسی عورت کے پہلے دس خاوند غیر برہمن موجود ہوں اور برہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے گا۔ کیونکہ برہمن ہی درحقیقت ان کے مالک ہوتے ہیں۔

انسانوں کی یہ تقسیم ہندو معاشرہ کے اندر تھی۔ باقی رہے غیر ہندو۔ سو انہیں وہ انسان ہی نہیں قرار دیتے تھے۔ انہیں ملیکش (یعنی ناپاک حیوان) سمجھتے تھے۔

یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ بنی اسرائیل خدا کی چہیتی اولاد ہیں۔ اس نسل سے باہر کے تمام انسان مردود و ملعون ہیں۔ نہ وہ اس دنیا میں زندگی کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں کے مستحق ہیں' نہ ہی اگلی دنیا میں جنت میں قدم رکھنے کے اہل۔ جہاں تک خود بنی اسرائیل کا تعلق ہے وہ احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے استبداد کی زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ ان کی اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔

عیسائیت آج عالمگیر انسانیت کا مذہب بننے کی مدعی ہے اور مساواتِ انسانیہ کی دعوے دار۔ لیکن (موجودہ محرف) انجیل میں صاف لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ "میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف آیا ہوں۔" اسی بنا پر وہ اپنے حواریوں کو تاکید کیا کرتے تھے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کے گھرانوں تک اپنے پیغام کو محدود رکھیں۔ غیر بنی اسرائیل کی بستیوں کی طرف مت جائیں (متی - ۱۰/۵) انہوں نے ان حواریوں سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ دیکھنا۔ پاک چیز کتوں کو مت دینا اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالنا۔ (متی ۷/۶) خود عیسائیوں کے اندر حالت یہ تھی کہ اربابِ کلیسا کے سامنے اور تو اور' ان کے بادشاہوں تک کو دم مارنے کی جا نہیں تھی۔

مجوسیوں کے ہاں بادشاہ کو "زمین پر خدا کا سایہ" تصور کیا جاتا تھا اور آتشکدوں کے موبد تمام قوم کے اعصاب پر سوار رہتے تھے۔ کاشتکاروں اور محنت کشوں کو انسانوں کی صف میں شمار ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ اور انہیں یہ کہہ کر مبتلائے فریب رکھا جاتا تھا کہ انسانوں کی یہ تفریق و تقسیم خدا کی مقرر کردہ تقدیر کی رُو سے ہوتی ہے جسے بدلنے کا کسی کو اختیار حاصل نہیں۔ نہ ہی اس کے خلاف لب کشائی کی اجازت۔ علامہ اقبالؒ نے انسان کی اس زبوں حالی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

بود انساں در جہاں انساں پرست — ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش — بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر — بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
از غلامی فطرتِ او دوں شدہ — نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

یہ تھی دنیا میں انسان کی حالت کہ قرآن آیا اور اس نے اس انقلابی اعلان سے فضائے عالم میں ارتعاش پیدا کر دیا کہ۔

تکریم آدم وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیٓ اٰدَمَ (۷۰/۱۷) یاد رکھو! ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ اس ایک اعلان نے انسان اور انسان کی پیدائشی اور بنیادی تفریق کو ختم کر دیا۔ اور رنگ۔ نسل۔ خون۔ قومیت یا (دوسری طرف) امیر اور غریب گھرانے میں پیدائش کی تمیز کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ یہ ہے مساواتِ محمدیؐ کا نقطۂ آغاز۔ پیدائشی تفریق کے مٹا دینے کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ وہ جو ایک طرف بزعمِ خویش اونچی ذات یا قبیلہ کا فرد ہونے کے اعتبار سے کبرِ نفس (SUPERIORITY COMPLEX) کا اور دوسری طرف کمتر درجہ کی ذات کی طرف نسبت سے عمر بھر احساسِ کمتری (INFERIORITY COMPLEX) کا مریض و اسیر رہتا تھا۔ انسان نے اس سے نجات پائی۔ اور دوسری طرف انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے مواقع تمام انسانی بچوں کے لئے یکساں طور پر کھل گئے۔ اور میدانِ عمل میں کسی کے سامنے کوئی پھاٹک نہ رہا کہ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۲۰/۱۷) جو بھی محنت اور کوشش کرتا ہے، ہم اسے آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ہم نے اپنی بخششوں کے راستے میں بند نہیں کھڑے کر دیئے کہ بعض انسانوں کو آگے چلنے کی اجازت ہو اور دوسروں کو وہیں روک دیا جائے۔ صلاحیتوں کی نشوونما کے مواقع سب کے لئے یکساں ہیں اور عمل کا میدان ہر ایک کے لئے کشادہ۔ اور اس کے بعد لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ (۱۹/۴۶) ہر ایک کے مدارج اس کے جوہرِ ذاتی اور حسنِ کردار کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔

یہ ہے مساواتِ محمدیؐ کا پہلا اصول۔ اس اصول کی رو سے کسی ایسے نظام کو حق حاصل نہیں کہ وہ مساواتِ محمدیؐ کا نام لے جس میں صورت یہ ہو کہ کوٹھی میں پیدا ہونے والے بچے کو، اس کے یومِ پیدائش سے زندگی کی تمام آسائشیں اور سہولتیں از خود میسر ہوں۔ آگے بڑھنے کے تمام مواقع اس کے سامنے کھلے ہوں۔ اعلیٰ درجہ کے اسکول اور کالج داخلہ کے لئے۔ بلند پایہ اساتذہ اور پروفیسروں کی ٹیوشن۔ ولایت تک کی یونیورسٹیوں تک رسائی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ مقابلہ میں ناکام رہے تو مدارج و مراتب کے بڑے سے بڑے مقامات خاندانی وجاہت کے اثرات یا دولت کے بل بوتے پر حاصل کرتا چلا جائے۔ دوسری طرف اسی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر (نوکر گھر) میں جنم لینے والا بچہ دودھ تک سے محروم ہو۔ بڑا ہو تو اول تو اسے کسی اسکول میں داخلہ ہی نہ ملے۔ داخلہ ملے تو ایسے اسکول میں جہاں تعلیم کے بجائے گالیاں اور بدتمیزیاں سکھائی جائیں اور اس کے ساتھ دعوے یہ ہو کہ تعلیم کے دروازے ہر ایک کے لئے یکساں کھلے ہیں، اور مقابلہ کے امتحانوں میں ہر طالب علم بیٹھ سکتا ہے۔

کیا اسی کا نام مساوات ہے؟ محمدیؐ مساوات میں اس عدمِ مساوات کا تصور تک نہیں ہو سکتا۔ اس میں تمام بچے انسانی بچے (بنی آدم) ہوتے ہیں۔ امیروں اور غریبوں کے بچے نہیں ہوتے۔ پیدا ہوتے وقت کوئی بچہ زر و جواہرات کی تھیلیاں اپنے ساتھ نہیں لاتا۔ نہ ہی حریر و اطلس کا لباس زیبِ تن کئے دنیا میں تشریف لاتا ہے۔ سب بچے خالی ہاتھ، ننگے بدن، مساوات کا عملی نمونہ بنے دنیا میں آتے ہیں۔ یہ ہمارا باطل نظام ہے جو ان میں پیدائش کی رو سے تفریق و تمیز پیدا کر دیتا ہے۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ قرآن کریم نے تمام انسانوں کو بنی آدم کہنے سے رنگ و نسل کے تمام امتیازات ختم کر دیئے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں یوں تو ساری دنیا میں رنگ و نسل کا امتیاز ایک مسلمہ کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس کی اولین مخاطب قوم (عربوں) میں یہ امتیاز و تفریق انتہائی شدت اختیار کر چکے تھے۔ ان میں نسلی تفاخر اور قبائلی عصبیت بنیادی خصوصیت تھی۔ قرآن نے مساواتِ انسانیہ کے اصول کے تحت اس تفاخر اور عصبیت کو ختم کر دیا۔ وہ قوم بیشتر بادیہ نشین، خانہ بدوشوں پر مشتمل تھی جن میں وجہِ تعارف قبائلی نسبت ہو سکتی تھی۔ اس نے کہا کہ قبائلی نسبتوں کو صرف باہمی تعارف کے لئے باقی رکھا جا سکتا ہے۔ یہ چیز باعثِ عزت و افتخار نہیں ہو سکتی۔ اس نے اعلان کیا کہ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ۔ اے نوعِ انسان! سن لو کہ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی۔ تمہاری پیدائش مرد اور عورت کے باہمی اختلاط سے ہوتی ہے وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ اس کے بعد تم جو قبیلوں اور خاندانوں میں بٹ جاتے ہو تو اسے تعارف کی غرض سے روا رکھا جا سکتا ہے کہ یہ تمہارے موجودہ نہجِ زندگی کا تقاضا اور طرزِ بود و ماند کی عملی ضرورت ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳) یہ چیز معیارِ عزت و فضیلت نہیں ہو سکتی۔ تم میں سے جو بھی فرائضِ خداوندی کو بہترین طور پر ادا کرتا ہے، وہی معزز ترین ہے۔ معیارِ عزت جوہرِ ذاتی ہے نہ کہ ذاتیں اور گوتیں۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کا اعلان حضورؐ نے اپنے آخری حج میں ان الفاظ میں فرمایا کہ

نسلی امتیاز

> اے نوعِ انسان! جان لو کہ تمہارا رب بھی ایک ہے اور تم اپنی اصل کے اعتبار سے بھی ایک ہی ہو۔ (لہٰذا نسلی امتیاز کوئی شے نہیں)۔ کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی برتری اور فضیلت نہیں۔ برتری اور فضیلت کا معیار تقویٰ ہے (جسے ہر انسان حاصل کر سکتا ہے)

یہ ہے مساواتِ محمدی کا دوسرا اصول۔ لہٰذا کوئی معاشرہ جس میں ذاتوں اور گوتوں کا امتیاز ہو، اسلامی قرار نہیں پا سکتا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جس میں باہمی تعارف کے لئے خاندانی یا قبائلی نسبتیں ناگزیر ہوں۔ اب یہ نسبتیں محض بغرضِ تفاخر قائم رکھی جاتی ہیں۔ سید، افغان، راجپوت، اعوان، بلوچ کہلانے والے ان نسبتوں سے اپنے پندارِ نفس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہیں اور نچلی ذات والوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ خالص ہندوانہ ورنوں کی تفریق و تقسیم ہے۔ ان تفریقات کی گرہیں اس قدر مضبوط ہیں کہ اونچی ذات والے نچلی ذات والوں کے ساتھ رشتہ ناطہ تو ایک طرف، معاشرتی روابط بھی روا نہیں رکھنا چاہتے۔ باقی ذاتیں تو پھر بھی کسی حد تک لچک روا رکھ لیتی ہیں لیکن سادات میں غیر سید کے ساتھ کسی سیدزادی کی شادی کا تصور بھی نہیں کیا جاتا۔ واضح رہے کہ قرآن اور حدیث بلکہ عربی معاشرہ اور زبان میں سید کا لفظ سردار کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے نسبی نسبت کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ عرب تو آج بھی اس لفظ کو سردار یا معزز کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ غیر مسلموں کو بھی السید کہہ دیتے ہیں۔ رسول اللہ کی طرف نسبی نسبت کے لئے اس لفظ کے استعمال کا رواج صرف ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔ مساواتِ محمدی پر مبنی نظام میں ذاتوں اور گوتوں کی یہ تفریق اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف بغاوت قرار پائے گی۔ اس میں مختلف قومیتوں کا تصور دین کی نقیض ہوگا۔ اس میں سب بنی آدم (انسانوں کے بیٹے) ہوں گے اور مسلم کے نام سے موسوم۔

(٭)

اب آگے بڑھیے۔ انسانوں میں حاکم اور محکوم کی تفریق، یوں نظر آتی ہے جیسے ازل سے چلی آ رہی ہے۔ راجوں، مہاراجوں

اور شاہوں شاہنشاہوں کو چھوڑیئے۔ انہیں تو منصبِ خدائی کا حامل سمجھا جاتا تھا .... جن لوگوں کے ہاتھ میں تھوڑا سا بھی اقتدار آجاتا وہ بھی اپنے آپ کو فوق البشر سمجھتے اور دوسرے انسانوں کو اپنا غلام تصور کرتے تھے۔

حاکم و محکوم

یہ تفریق ایسا مسلمہ بن چکی تھی ــــ یا یوں کہیئے کہ صاحبِ اقتدار طبقہ نے جو بحیثیت حاکمین اور مذہبی پیشوائیت پر مشتمل تھا، ایسا سحر پھونک رکھا تھا کہ کسی کے دل میں اس کے خلاف ہلکا سا احساس بھی نہیں ابھرتا تھا۔ اگر کبھی ایسا ہوتا کہ کسی خاص صاحبِ اقتدار کے خلاف جذبۂ عداوت ابھرتا تو اس سے مقصد صرف اتنا ہوتا کہ اس کی جگہ کوئی اور حاکم لے لے۔ اس نظام کو مٹانے کا خیال کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا۔

قرآن آیا اور اس نے کہا کہ سوال اچھے اور بُرے حاکم کا نہیں۔ وہ نظام کیسر باطل ہے جس میں بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں پر حقِ حکومت حاصل ہو۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ــــ خواہ اسے ضابطۂ قوانین حکومت اور نبوت بھی کیوں نہ مل گئی ہو کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں میرے محکوم اور غلام بن جاؤ۔

اس ایک اعلان نے ان زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جن میں مفاد پرست گروہوں نے صدیوں سے اپنے ہی جیسے انسانوں کو بُری طرح جکڑ رکھا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ تصورِ مساواتِ انسانیہ کی تنقیص اور شرفِ آدمیت کی تذلیل ہے کہ ایک انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کو اپنا حاکم سمجھے اور اس کے سامنے جھکے۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے جس کا عملی ذریعہ اس کے عطا کردہ اصول و اقدار (قرآن مجید) کی تعمیل ہے۔ اس اصول کو ملنے والے باہمی مشاورت سے ایک ایسی مشینری وضع کرتے ہیں جو ان اصول و اقدار کو معاشرہ میں نافذ کرے۔ ان لوگوں کو دوسرے لوگوں پر کسی قسم کا کوئی تفوق حاصل نہیں ہوتا۔ تفوق اور برتری تو ایک طرف، ان کا کوئی الگ گروہ بھی نہیں ہوتا۔ اربابِ حکومت یا مذہبی پیشواؤں کے الگ گروہ کا وجود دیگر خلاف اسلام ہے۔ یہ لوگ خدا کے جن احکام کو معاشرہ میں نافذ کریں گے ان کا سب سے پہلے اطلاق خود ان کی اپنی ذات پر بھی ہوگا۔ اس سلسلہ میں اور تو اور، خود حضور نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا کہ

اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۔ (۶/۱۵)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کی سزا سے میں بھی مامون نہیں رہ سکتا۔ مجھے بھی اس کا خوف ہے۔

اور سربراہ کی بیویوں (ازواجِ مطہراتؓ) سے کہا گیا کہ اگر تم سے کوئی خلافِ قانون حرکت سرزد ہوئی تو تمہیں دوہری سزا ملے گی۔ (۳۳/۳۰)

یہ مساواتِ محمدیؐ کا تیسرا اصول ہے۔ لہٰذا جس نظام میں بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں پر حقِ حکومت حاصل ہو اس میں مساواتِ محمدیہ کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جمہوری نظام میں کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں بالادستی قانون کی ہوتی ہے، انسانوں کی نہیں۔ یہ وہ فریب ہے جو نہایت

جمہوری نظام

سادگی و پرکاری سے عوام کو دیا جاتا ہے۔ اس میں نظری طور پر کہا جاتا ہے کہ مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ

(مساوات) عوام کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن عملاً یہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو انتخابات کے ذریعے اکثریت میں آجاتے ہیں۔ انہیں قانون سازی کا بھی حق حاصل ہوتا ہے اور قانون کے اجرا کا بھی۔ سوچئے کہ جس گروہ کو قانون سازی کا حق حاصل ہو اسے حقِ حکومت حاصل نہیں ہوتا تو اور کیا ہوتا ہے؟ اور یہ حق ایسا مطلق (ABSOLUTE) ہوتا ہے کہ اس کے خلاف کہیں داد فریاد نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ استبدادِ حکومت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دین کے سیاست سے جدا ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ خدا کے قوانین کو نہیں بلکہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو حاصل ہو۔ اس کا نتیجہ بہرحال میں چنگیزیت ہوتا ہے خواہ اس کی شکل (FORM) کوئی سی بھی ہو۔ عام جمہوریت تو ایک طرف، اقبالؒ کی نگہ دوررس نے تو یہاں تک بھانپ لیا تھا کہ

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو، پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

یاد رکھیے۔ کوئی نظامِ حکومت بھی ہو جب تک اس میں اقتدار و اصولِ خداوندی کو بالادستی حاصل نہ ہو، حاکم و محکوم کی تفریق مٹ نہیں سکتی۔ جس نظام پر غیر متبدل اقدارِ سماوی کا کنٹرول ہو اسی سے وہ مساوات پیدا ہوتی ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست ٭ عبد و مولاؔ حاکم و محکوم نیست

جہاں یہ کیفیت نہ ہو، اس کا نتیجہ بہرحال تباہی ہوتا ہے کہ عدالتِ خداوندی میں، تذلیلِ انسانیت وہ جرمِ عظیم ہے جس کی معافی نہیں۔

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے - حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

(۸)

سیرتِ محمدیؐ کے آئینے میں

یہاں تک میں نے مساواتِ محمدیؐ کی اصولی بحث کی ہے۔ آئیے اب اس مساوات کی جھلک سیرتِ محمدیؐ کے آئینے میں دیکھیں۔ اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جس بزرگ و برتر ہستی ؐ کی سیرتِ طیبہ کی یہ جھلکیاں ہیں،

(۱) وہ عرب کی ممتاز ترین قوم قریش کے معزز ترین قبیلہ 'بنی ہاشم' کا واجب التکریم فرد ہے۔ لہٰذا اُس زمانے کے حسب نسب کے معیار کی رو سے اس کا مقام بہت بلند ہے۔

(۲) وہ خدا کا رسول ہے جس کے ہر حکم کی اطاعت جماعتِ مومنین کے لئے فریضۂ خداوندی ہے۔

(۳) اور وہ دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کا سربراہ بھی ہے۔

دیکھیے کہ اس قدر بلند و بالا مقام پر فائز ہونے کے بعد اس علمبردارِ حریت و تکریمِ آدمیت نے مساواتِ انسانیہ کے کس قسم کے نمونے دنیا کے سامنے پیش کئے۔ جو واقعات میں پیش کروں گا وہ بظاہر چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن اربابِ بصیرت بالخصوص علمائے نفسیات جانتے ہیں کہ انسان کے صحیح کیریکٹر کا اندازہ اس کی روزمرہ کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے

بہتر طور پر لگ سکتا ہے۔ یہی وہ آنکھ کا تل ہے جس میں آسمان کے ستارے جھلمل جھلمل کرتے نظر آتے ہیں۔

(۱) ایک دفعہ کسی نے آپ سے خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا۔ یا سیدنا۔ (اے ہمارے آقا)۔ اس پر آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ دیکھو۔ تمہیں شیطان بہکا رہا ہے۔ آقا صرف خدا کی ذات ہے۔ میں تو عبداللہ کا بیٹا محمدؐ خدا کا عبد اور اس کا رسول ہوں۔ آقائیت (سرودی) صرف خدا کی ذات کے لیے ہے۔

(۲) ایک شخص خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوا تو آپ کے مرتبہ بلند کے احساس سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں۔ میں کوئی فوق الفطرت ہستی نہیں۔ ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔

(۳) ایک دفعہ آپؐ تشریف لائے تو صحابہؓ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ فرمایا کہ یہ عجمیوں کا دستور ہے۔ ایسا نہ کیا کرو۔ اس کے برعکس حضرت فاطمہؓ تشریف لاتیں تو آپؐ کھڑے ہو جاتے کہ یہ تقاضائے شفقت تھا، تمیز بندہ و آقا نہیں تھی۔

(۴) قبائل کے نمائندے اور دوسری سلطنتوں کے وفود آتے تو انہیں پہچاننے میں دقت ہوتی کہ اس مملکت کا حکمران کون ہے۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر صحابہؓ نے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا کہ آپؐ اس پر بیٹھا کریں۔ آپؐ نے دیکھا تو غصے سے چہرہ تمتما اٹھا۔ چبوترہ کو ٹھوکر مار کر گرا دیا اور فرمایا کہ تم لوگ یہ وہ امتیاز پیدا کرنے لگے جسے مٹانے کے لئے میں آیا ہوں۔ تم نے آج مٹی کا چبوترہ بنایا ہے، بعد میں آنے والے اسے تختِ حکومت میں تبدیل کر دیں گے۔

(۵) ایک دفعہ ایک صحابی نے دیکھا کہ آپؐ اپنا جوتا مرمت کر رہے ہیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کہا کہ لائیے جوتا میں گانٹھ دوں۔ ایک تبسم جنت فروش کے ساتھ فرمایا کہ نہ بھائی! ہر شخص کو اپنا کام آپ کرنا چاہیئے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا" خدا کا پیغام ہے۔

(۶) مسجدِ نبویؐ کی تعمیر ہو رہی تھی تو آپؐ بھی دیگر رفقاء کے ساتھ مزدوروں کی طرح مٹی ڈھو رہے تھے۔ خندق کھدی تھی تو آپؐ بھی دوسروں کے ساتھ کدال چلا رہے تھے۔ دوستوں کی مجلس میں دعوت کا سامان تھا۔ سب نے کام بانٹ لئے آپؐ نے فرمایا کہ میں جنگل سے لکڑیاں لاؤں گا۔ صحابہؓ نے تامل کیا تو فرمایا کہ میں امتیاز پسند نہیں کرتا۔ غزوہ بدر میں سواری کے جانور کم تھے، اس لئے لوگ باری باری سوار ہوتے تھے۔ حضورؐ نے بھی اپنی باری مقرر کر رکھی تھی۔ جانثار صحابہؓ اپنی باری حضورؐ کی خدمت میں پیش کرتے تو آپؐ فرماتے کہ نہ تم مجھ سے زیادہ پیدل چل سکتے ہو اور نہ میں تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں۔ مجاہد میدان میں جاتے تو جن کے گھروں میں پیچھے کوئی مرد نہ ہوتا، ان کے گھر کے کام آپؐ خود جا کر کر دیتے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی لونڈی بھی آپؐ سے کوئی کام کہہ دیتی تو آپ اُس کے لئے بھی اٹھ کھڑے ہوتے۔

(۷) اب آگے بڑھیئے۔ بدر کے قیدیوں کو رسیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ انہی میں آپؐ کے سن رسیدہ چچا عباسؓ بھی تھے حضورؐ نے ان کے کراہنے کی آواز سنی تو چہرہ غم آلود ہو گیا۔ رفقاء بھانپ گئے اور جا کر عباسؓ کی رسیاں ڈھیلی کر دیں۔ ان کے کراہنے کی آواز بند ہو گئی تو آپؐ نے اس کی وجہ دریافت فرمائی۔ صحابہؓ نے بتایا تو آپ سخت ناراض ہوئے۔ فرمایا کہ یا تو سب قیدیوں کی رسیاں ڈھیلی کر دی جائیں یا عباسؓ کی رسیاں بھی انہی کی طرح کس دی جائیں۔ اسی قسم کی تخصیص سے تو انسانیت تباہ ہوتی ہے۔

(۸) اور وہ واقعہ بھی تو اسی جنگِ بدر کا ہے جس کے تصور سے روح وجد میں آجاتی ہے۔ جنگ کے قیدیوں میں حضورؐ کے داماد ابو العاصؓ بھی تھے۔ فیصلے کے مطابق ان قیدیوں کا فدیہ طلب کیا گیا تو آپؐ کی بیٹی حضرت زینبؓ نے

کلائی کا ایک ہار بطور فدیہ بھیجا۔ ہار سامنے آیا تو گذشتہ تیس سال کے واقعات ایک ایک کر کے آپؐ کی نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ یہ وہ ہار تھا جسے حضورؐ نے اپنے نکاح پر حضرت خدیجہؓ کو تحفۃً دیا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے یہی ہار حضرت زینبؓ کی شادی پر الوداعی تحفہ کے طور پر بیٹی کے زیبِ گلو کیا تھا۔ کلائی کے اس ہار کی قیمت تو کیا ہو سکتی تھی، لیکن محبت و رفاقت کے مقدس جذبات کی ایک دنیا اس میں جھلمل جھلمل کر رہی تھی۔ آپؐ فوج کے "کمانڈر انچیف" بھی تھے اور سربراہِ مملکت بھی۔ آپ بلا تامل اس ہار کو باقی ڈھیر سے الگ کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا کرنے سے اصولِ مساوات کو زد پہنچتی۔ آپؐ نے مجلسِ مشاورت کو بتایا کہ اس ہار کی کیفیت کیا ہے اور کہا کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو اسے بیٹی کو واپس دے دیا جائے۔ ان کی تصویب سے ہار واپس کیا گیا۔۔۔ اسوۂ محمدیؐ نے بتایا کہ جب جذبات تقاضائے عدل پر غالب آ جائیں تو آبگینۂ مساوات چکنا چور ہو جاتا ہے۔

(۹) اب اس باب میں اُس واقعہ کو سامنے لائیے جو اس موضوع پر گویا حرفِ آخر ہے اور جسے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن نے اپنے اوراق میں محفوظ کر رکھا ہے۔ وہ واقعہ متعلق ہے حضرت زیدؓ سے۔ حضرت زیدؓ ایک غلام تھے جسے حضورؐ نے آزادی عطا کی تھی۔ ایک غلام کا آزاد ہونا ہی کچھ کم باعثِ شرف نہ تھا کہ اس کے بعد آپؐ نے اسے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا اور اس کی پرورش خود اپنے گھر میں کی۔ اس کے بعد اس کی شادی بنو ہاشم کی ممتاز ترین خاتون، اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے کر دی۔ سوءِ اتفاق کہ وہ شادی کامیاب نہ ہو سکی اور حضرت زیدؓ نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔

آپ غور کیجئے کہ حضرت زیدؓ کا یہ ارادہ آپؐ پر کس قدر شاق گذرا ہو گا۔ آپؐ گئے اور حضرت زیدؓ سے کہا کہ

اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ - (۳۳/۳۷)

اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔

غور فرمائیے کہ یہ کہنے والا کون ہے اور کہا کس سے جا رہا ہے! کہنے والا خدا کا رسولؐ ہے جس پر ایمان لانے سے (حضرت) زیدؓ مسلمان کہلاتے ہیں اور جس کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک تیرے فیصلوں کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم نہ کر دیں کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہ ہو۔ کہنے والا سربراہِ مملکت بھی ہے جس کی رعایا میں سے حضرت زیدؓ ہیں۔ کہنے والا وہ محسن ہے جس نے (حضرت) زیدؓ کو غلامی سے آزاد کیا۔ کہنے والا بمنزلہ باپ کے ہے اور جسے کہا جا رہا ہے وہ بمنزلہ بیٹے کے۔ اور کہنے والا اس معزز خاتون کا بزرگ بھی ہے۔

کہیئے کہ اس کے بعد (حضرت زیدؓ) کو اس کی جرأت ہو سکتی تھی کہ وہ اس حکم کی خلاف ورزی کرے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کیا کیا۔ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ سوچئے کہ آج اگر کسی پیر کا مرید، کسی افسر کا ماتحت، کسی حاکم کا محکوم، کسی باپ کا بیٹا، کسی محسن کا احسان مند، کسی بڑے کا چھوٹا، ایسا کرتا تو کیا قیامت نہ بپا ہو جاتی۔ لیکن وہاں کیا ہوا؟ نہ ماتھے پر شکن آیا، نہ زیدؓ پر کوئی عتاب نازل ہوا۔ حتیٰ کہ باہمی تعلقات میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ وہی زیدؓ وہی نبی اکرمؐ۔ اس لئے کہ وہاں تو سکھانا یہ مطلوب تھا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان کو اپنے ذاتی فیصلوں کا پابند بنائے۔ خواہ جذبات کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ حضورؐ کا یہ حکم نہ بحیثیت رسول تھا اور نہ بہ منصبِ سربراہِ مملکت۔ یہ ایک ذاتی مشورہ تھا۔ قرآن نے حضورؐ کی انہی حیثیتوں کے فرق کو نمایاں کرنے کے لئے اس واقعہ کو اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا ہے۔ ضمناً جو لوگ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا ہر قول وحی پر مبنی ہوتا تھا، انہیں سوچنا چاہیئے کہ آپؐ نے جو کچھ حضرت زیدؓ سے کہا تھا وہ "اگر حکمِ خداوندی تھا تو کیا اس کی خلاف ورزی سے حضرت زیدؓ (معاذ اللہ) معصیتِ خدا و رسولؐ کے سنگین ترین جرم کے

مرتکب ہوتے تھے؟ کیا یہ حضرات ایسا کہنے کے لئے تیار ہیں؟ یہ خدا کا حکم نہیں تھا۔ حضورؐ کا ذاتی مشورہ تھا۔

(۱۰) یہ تو پھر بھی ایک صحابیؓ کا واقعہ ہے۔ مدینہ میں بریرہ نامی ایک لونڈی تھی جو بوجہ آزادی اپنے شوہر (مغیث) سے الگ ہو گئی تھی۔ (حضرت) مغیثؓ کی درخواست پر حضورؐ نے بریرہ سے کہا کہ وہ اپنے شوہر سے الگ نہ ہو۔ ذرا سوچئے کہ اس لونڈی سے یہ بات کہنے والا کون ہے۔ لیکن وہاں تو حریت و آزادی کی ایسی تعلیم دے رکھی تھی کہ لونڈیوں تک کو اظہارِ خیال اور فیصلہ کی پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ بریرہؓ نے عرض کیا کہ کیا آپ ایسا کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ حکم تو نہیں۔ اس پر اس نے کہا کہ پھر معاف فرمائیے۔ میں اس مشورہ کو ماننے کے لئے تیار نہیں — اور حضورؐ ایک تبسم عاجز نواز کے ساتھ تشریف لے گئے۔

(۱۱) ان واقعات سے بھی کہیں زیادہ درد انگیز لیکن بصیرت افروز اُس یہودی کا واقعہ ہے جسے حضورؐ نے بحیثیت جج جرم قتل میں موت کی سزا کا حکم سنایا تھا۔ جلاد اس کے سر پر تلوار لئے کھڑا آخری اشارے کا منتظر تھا کہ اتنے میں اس یہودی کی ایک خورد سالہ بچی، روتی، چیختی، چلاتی دوڑی دوڑی آئی اور حضورؐ کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ کر التجا کی کہ مجھے یتیم ہونے سے بچا لیجئے۔ اس کی آہ و فغاں اس قدر درد آلود تھی کہ حضورؐ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ صحابہؓ نے سمجھا کہ حضورؐ قتل کا حکم واپس لے لیں گے۔ لیکن آپؐ نے بچی کے سر پر محبت بھرا ہاتھ پھیرا اور جلاد کو قتل کا اشارہ دے دیا۔ بعد میں صحابہؓ کے دریافت کرنے پر حضورؐ نے جو فقرہ ارشاد فرمایا وہ جذبات اور فریضہ کی ادائیگی کی کشمکش میں ابدی راہ نمائی کا حکم رکھتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت محمدؐ بن عبداللہ کی آنکھ رو رہی تھی اور محمدؐ رسول اللہ کا ہاتھ خدا کا حکم نافذ کر رہا تھا۔

محمدؐ بن عبداللہ اور محمدؐ رسول اللہ میں یہی وہ نازک فرق تھا جس کا ملحوظ رکھنا مساوات کا سنگ بنیاد بنتا ہے۔ یہی وہ فرق تھا جسے حضورؐ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں ان الفاظ میں واضح کر دیا تھا کہ جب کہا تھا کہ:

اے پیغمبرؐ کی بیٹی فاطمہؓ! اور اے پیغمبرؐ کی پھوپھی صفیہؓ!! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو۔
میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکوں گا۔

قانون اور عدل میں رسول اللہ کی بیٹی یا سربراہِ مملکت کی پھوپھی ہونا بھی کچھ فرق نہیں پیدا کر سکتا۔ حضورؐ کے رشتہ دار تو ایک طرف خود حضورؐ کی اپنی ذات کے سلسلہ میں بھی نہیں۔ مدینہ میں کسی شخص کی کچھ کھجوریں آپ کے ذمہ قرض تھیں۔ وہ تقاضا کے لئے آیا تو آپؐ نے ایک انصاری سے کھجوریں لے کر اسے واپس کرنا چاہیں۔ اس نے یہ کہہ کر انہیں لینے سے انکار کر دیا کہ یہ کھجوریں میری کھجوروں سے ناقص ہیں۔ اس انصاری نے اس سے کہا کہ کیا ظلم کر رہے ہو۔ رسول اللہ کی عطا کردہ کھجوروں کو رد کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ میں عدل کا تقاضا کر رہا ہوں۔ اگر حضورؐ ہی عدل نہیں کریں گے تو پھر اور کس سے عدل کی توقع کی جائے گی۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ ہاں! یہ سچ کہتا ہے۔ اسے عدل کا تقاضا کرنے دو۔

ایک طرف مطالبۂ عدل کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف عفو کریمانہ کی یہ کیفیت کہ ایک شخص ہبار بن اسود نے زمانہ ہجرت میں حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو برچھی مار کر زخمی کر دیا تھا جس سے ان کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔ اس صدمہ کا حضورؐ کے سینے پر گہرا داغ تھا۔ فتح مکہ کے بعد ہبار چھپتا پھر رہا تھا اور صحابہؓ اس کی تلاش میں تھے۔ بالآخر اس نے تنگ آکر ایک ایسا گوشۂ عافیت تلاش کر لیا جہاں اُسے کسی قسم کا خوف نہ تھا اور وہ گوشہ تھا خود حضورؐ رحمتِ دو عالم کا دامنِ عافیت۔ وہ خود یہ کہتا ہوا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا کہ

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

اور عرض کیا کہ مجھ سے عہدِ جاہلیت میں جو جرم سرزد ہو گیا تھا مجھے اس کا اعتراف ہے۔ آپ جو سلوک بھی مجھ سے کرنا چاہیں اس کے لئے حاضر ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ! ہم نے تمہیں معاف کر دیا۔

اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ ایک جنگ میں قبیلہ طے کی ایک لڑکی قیدی کی حیثیت سے گرفتار ہو کر سامنے آئی تو وہ برہنہ سر تھی۔ حضورؐ نے دیکھا تو تلملا کر اُٹھے۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو کوئی فالتو کپڑا نظر نہ آیا۔ اپنی چادر جو نیچے بچھا رکھی تھی، اٹھائی اور نہایت شفقت سے اُسے اوڑھا دی۔ آپؐ اس ردائے مقدس سے اس کا سر ڈھانپ رہے تھے اور فضائے عالم میں یہ نشید جانفزا گونج رہی تھی کہ

برتر از گردوں مقامِ آدم است　　　اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

مساواتِ انسانیہ کا یہی وہ پیغام اور احترامِ آدمیت کی یہی وہ تلقین تھی جس کے لئے حضورؐ کی زبان مبارک سے بار بار اعلان کرایا جاتا تھا کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ — میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔ اور اس اعلان کا عملی مظاہرہ اس انداز سے کیا جاتا کہ کسی کے دل میں حضورؐ کے فوق البشر ہونے کا خیال تک نہ آنے پائے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جس دن آپؐ کے صاحبزادے (ابراہیمؓ) کا انتقال ہوا اتفاق سے اس روز سورج کو گہن لگ گیا۔ وہ تو خیر پھر بھی عرب کا ملک تھا اور آج سے چودہ سو سال پہلے کا تاریک زمانہ۔ اس قسم کا واقعہ اگر آج بھی کسی، روحانی پیشوا کے متعلق رونما ہو جائے تو لوگ فوراً اس کے حضور عقیدت مندی کا سر جھکا دیں۔ مختلف قبائل کے لوگ دوڑے دوڑے آئے اور کہا کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپؐ واقعی خدا کے رسولؐ ہیں کیونکہ آپؐ کے غم میں اجرامِ فلکی بھی سیاہ پوش ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی اور ہوتا تو اس واقعہ اور عوام کے ردِعمل کو ضرور (EXPLOIT) کر لیتا لیکن آپؐ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ اگر کسی کے دل میں یہ خیال آتا ہے میرے شریکِ غم ہونے کی وجہ سے سورج کو گہن لگا ہے تو اسے چاہیئے کہ ایسا خیال دل سے نکال دے۔ چاند اور سورج کو گہن فطرت کے اٹل قوانین کی رُو سے لگتا ہے۔ کسی کے مرنے جینے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ میں بھی تمہارے جیسا ایک انسان ہوں، اور میری اولاد بھی تمہاری اولاد جیسی ہے۔ اس لئے میرے بیٹے کی وفات کوئی ایسا خلافِ معمول واقعہ نہیں جس پر اجرامِ فلکی ماتم کریں۔ یاد رکھو! "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ"۔

یہ ہیں عزیزانِ من! مساواتِ محمدی کی چند جھلکیاں جس نے عملاً بتایا کہ کس طرح تمام انسان ایک پروردگار کے بندے ایک اصل کی شاخیں، اور ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔ کس طرح یہ سب انسان ہونے کی جہت سے یکساں احترام و تکریم کے مستحق ہیں اور ان میں ذاتی جوہر اور حسنِ سیرت و کردار کے سوا کوئی معیارِ تفریق و تخصیص نہیں۔ اُن اقدارِ خداوندی کے مظہر اور سیرتِ نبوی کے آئینہ دار معاشرہ ہی کو مساواتِ محمدیہ کا عکاس کہا جا سکتا ہے۔ جس معاشرہ میں کسی انسان کی عزتِ نفس کو ذرا سی بھی ٹھیس لگ جائے اسے اپنے آپ کو اُس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی طرف منسوب کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ مساواتِ محمدی کا مقام بڑا وقیع اور رفیع ہے۔

ایں کوہ گران است بجائے نفروشند　　　باخونِ دلِ خویش خریدن دگر آموز

اب آئیے انسان کی طبیعی زندگی کی طرف۔ اسے ایک بار پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ انسان کی طبیعی زندگی مقصود بالذات نہیں یہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد ہے انسان کی انسانی زندگی کی نشو و نما۔ چونکہ زندگی کی موجودہ منزل میں انسان کی انسانی زندگی کی نشو و نما اس کے طبیعی پیکر کے اندر رہتے ہوئے ہی ممکن ہے اس لئے اس کی طبیعی زندگی کی پرورش بھی ضروری ہے۔

قرآن کا معاشی نظام

اس کے لئے قرآن کریم نے جو معاشی نظام دیا ہے اس میں اس بنیادی حقیقت کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سامانِ زیست ہر فرد معاشرہ کو میسر آجائے لیکن کسی کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج اور دست نگر نہ ہو۔ اگر کسی شخص کو روٹی دے دی جائے لیکن اس کی عزتِ نفس چھین لی جائے تو قرآن اس قسم کی حیاتِ بے شرف پر مرگِ باشرف کو ہزار بار ترجیح دیتا ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی ہے کہ

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

روٹی، کپڑا، مکان بلکہ ہر قسم کی حفاظت جیلخانے میں حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جیل کی زندگی کو بدترین زندگی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہاں یہ سب کچھ حاصل ہوتا ہے لیکن شرفِ انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے جس معاشی نظام کی بنیاد ایسے فلسفہ پر ہو جس میں انسانی زندگی کو محض طبیعی سمجھا جائے اس میں انسانی اقدار کے تحفظ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر اس نظام میں روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ مہیا بھی ہو جائے تو بھی انسان حیوانات کی سطح پر رہتا ہے، انسانی سطح پر نہیں آسکتا۔ اس کے برعکس قرآنی نظام میں میسر آنے والے رزق کو صرف رزق نہیں کہا گیا، اسے رزقِ کریم کہہ کر پکارا گیا ہے: "باعزت روٹی" یعنی وہ سامانِ زیست جس میں شرفِ انسانیت برقرار رہے۔ ان دونوں نظاموں میں یہی بنیادی فرق ہے جسے اقبالؒ نے یوں بیان کیا ہے کہ

آں خدا نانے دہد، جانے دہد ۔ ایں خدا نانے دہد، جانے برد

اسی بنا پر حضورؐ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ۔۔ الصدقۃ تمیت القلب ۔ خیرات سے انسان کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔ قرآنی نظام میں سامانِ زیست مملکت کی طرف سے ملتا ہے نہ کہ افراد کے ہاتھوں۔ اور اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کی ضرورت پوری کرے تو وہ نہایت خلوص دل سے اس کی وضاحت کر دے گا کہ۔ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۔ (۷۶/۹)۔ جو کچھ ہم دے رہے ہیں اس کا تم سے معاوضہ لینا تو ایک طرف، ہم اس کے لئے شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔ اس معاشرہ میں جو کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے اس کے متعلق بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۷۰/۲۴-۲۵) یہ ان کا مسلّمہ حق ہے جو انہیں دیا جاتا ہے۔

لفظ رزق میں وہ تمام اشیاء آجاتی ہے جن پر زندگی کا دارومدار اور اس کی نشو و نما کا انحصار ہے۔ اس سلسلہ میں مساوات کا لفظ وضاحت طلب ہے۔ اشیائے زیست میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی ضرورت تمام انسانوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ۔ ان اشیاء کی ضرورت کے ضمن میں مختلف افراد

میں مقدار (QUANTITY) کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کا پیٹ دو روٹیوں سے بھر جاتا ہے۔

مساوات کا مفہوم

دوسرے کی بھوک چار روٹیوں کی ہوتی ہے۔ پست قامت آدمی کو تھوڑے سے کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے، لانبے آدمی کو زیادہ کی۔ مختصر کنبہ کے لئے چھوٹا سا مکان کافی ہو سکتا ہے۔ بڑے کنبے کو وسیع مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تفاوت 'مساوات' کے خلاف نہیں۔ ہماری مذہبی پیشوائیت' جو اس نظام سرمایہ داری کی محافظ ہے جو ہمارے ہاں دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا 'مساوات' سے مراد 'مقدار کی یکسانیت' لے کر قرآنی نظام معیشت پیش کرنے والوں کا مذاق اڑاتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ سورۃ حٰم سجدہ میں'

مضحکہ انگیز تفسیر

زمین کی پیداوار کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۔ (۴۱/۱۰) یعنی زمین کی پیداوار کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے کہ وہ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب فرماتے ہیں:

> موجودہ زمانے میں جن لوگوں نے مارکسی تصورِ اشتراکیت کا اسلامی ایڈیشن "قرآنی نظام ربوبیت" کے نام سے نکالا ہے وہ "سواء للسائلین" کا ترجمہ "سب مانگنے والوں کے لئے برابر" کرتے ہیں۔ اور اس پر استدلال کی عمارت یوں اٹھاتے ہیں کہ اللہ نے زمین میں سب لوگوں کے لئے برابر خوراک رکھی ہے۔ لہٰذا آیت کا منشا پورا کرنے کے لئے ریاست کا ایک ایسا نظام درکار ہے جو سب کو غذا کا مساوی راشن دے کیونکہ انفرادی ملکیت کے نظام میں وہ مساوات قائم نہیں ہو سکتی جس کا یہ "قرآنی قانون" تقاضا کر رہا ہے۔ لیکن یہ حضرات قرآن سے اپنے نظریات کی خدمت لینے کے جوش میں یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سائلین جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے صرف انسان ہی نہیں بلکہ مختلف اقسام کی وہ سب مخلوقات ہیں جنہیں زندہ رہنے کے لئے غذا کی ضرورت ہے کیا ان سب کے درمیان یا ایک ایک قسم کی مخلوقات کے درمیان خدا نے سامانِ پرورش میں مساوات رکھی ہے .... پھر وہ یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ سائلین میں وہ حیوانات بھی شامل ہیں جنہیں انسان پالتا ہے اور جن کی خوراک کا انتظام انسان ہی کے ذمے ہے۔ مثلاً بھیڑ بکری، گائے بھینس، گھوڑے، خچر، اونٹ وغیرہ۔ اگر قرآنی قانون یہی ہے کہ سب سائلین کو برابر خوراک دی جائے، اور اسی قانون کو چلانے والی ایک ریاست مطلوب ہے تو کیا وہ ریاست' انسان اور حیوانات کے درمیان معاشی مساوات قائم کرے گی۔

(تفہیم القرآن۔ جلد چہارم۔ صفحات ۴۴۲-۴۴۳)

اس تفسیر کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا عرض کیا جائے کہ خدا' اپنی کتاب عظیم کو اس قسم کے مفسروں سے محفوظ رکھے جنہوں نے اسلام کو اضحوکہ (LAUGHING STOCK) بنا دیا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کل کو اگر ان حضرات سے کہا گیا کہ اسلامی

؎ معلوم نہیں ایسا کس نے کہا ہے؟

نظامِ عدل کی رُو سے قانون کی نگاہ میں سب برابر ہوتے ہیں تو اس سے یہ مراد نہ لیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں ہر مجرم کو ایک جیسی سزا ملے گی! اسی قسم کے ہیں وہ مفسرین جن کے متعلق اقبالؒ نے اپنا سر پیٹ کر کہا تھا کہ

زمن بر صوفی و ملا سلامے — کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیلؑ و مصطفیٰؐ را

انہیں کون بتائے کہ رزق کی مساوات سے مفہوم وہ ہے جسے حضور نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ

جس بستی میں کسی شخص نے اس حالت میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے خدا کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مسند امام احمدؒ)

یعنی اگر سب سیر ہو جائیں اور ایک شخص بھوکا رہے تو یہ عدم مساوات ہے۔ مساوات یہ ہوگی کہ سب سیر ہو کر سوئیں۔ اور اگر کسی وجہ سے کبھی ایسا ہو کہ سب بھوکے رہ جائیں، تو وہ بھی مساوات ہوگی۔ اور اگر اس میں حیوانات کو بھی شامل کر لیا جائے تو سواءً للسائلین کی تفسیر حضرت عمرؓ کے اس اعلان میں ملے گی جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ

اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

(توفیق الرحمٰن)

قرآنی نظام میں مساوات سے مراد کمیت (QUANTITY) کی یکسانیت نہیں۔ اس سے مراد کیفیت (QUALITY) کی یکسانیت ہے۔ طبیعی زندگی کی یکسانیت کے متعلق اقبالؒ نے ایک مصرعہ میں ساری حقیقت کو یہ کہہ کر سمو دیا ہے کہ — خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست —

کیفیت کی یکسانیت

طبیعی جسم کی ضروریات بادشاہ اور مزدور دونوں کی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ وہ کون سی طب ہے جو یہ کہتی ہے کہ ایک کروڑپتی کے بچے کے ناشتہ میں سیب، بادام، مکھن، بالائی، انڈے، طبیعی ضروریات میں سے ہیں، اور مزدور کے بچے کی ضرورت سوکھی روٹی؟ البتہ بشرطیکہ وہ بھی میسر آ جائے! انفرادی ذوق یا تقاضائے محنت کے لحاظ سے اس میں کچھ تنوع پیدا کر لینا اور بات ہے لیکن معیار سب کا یکساں ہوگا۔ قرآنی نظام میں اس قسم کا تفاوت نہیں ہوتا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عہدِ فاروقی میں جب آذربائیجان کا علاقہ فتح ہوا تو جیوشِ اسلامیہ کے سپہ سالار حضرت عتبہ بن فرقد نے وہاں کی ایک خاص مٹھائی کے دو ٹوکرے امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجے۔ آپ نے مٹھائی کو چکھا تو اسے بہت پسند کیا۔ لیکن کھانے سے پہلے قاصد سے پوچھا کہ اسے تمام مجاہدین نے کھایا ہے؟ قاصد نے جواب دیا کہ نہیں! یہ تو صرف آپ کے لئے ہے اس پر آپ نے عتبہ کو جو خط لکھا وہ ہمارے پیشِ نظر نکتہ کی بہترین تفسیر ہے۔ آپ نے لکھا۔

اللہ کے بندے امیر المؤمنین کی طرف سے عتبہ بن فرقد کے نام۔

امابعد! اے فرقد تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جو کچھ خدا نے ہمیں عطا کیا ہے، وہ نہ تمہاری ذاتی محنت اور مشقت کا نتیجہ ہے نہ تمہارے ماں باپ کی محنت و مشقت کا نتیجہ۔ یہ تمام مسلمانوں کی مشترکہ محنت کا ثمر ہے، اس لئے ہم کوئی ایسی چیز نہیں کھاتے جو تمام مسلمانوں کے گھروں میں کافی مقدار میں نہ ہو۔ (بلاذری۔ فتوح البلدان)

یہ ہے رزق کی مساوات کا مفہوم۔ یہی عقبہ جب ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے ہاں آئے تو آپ کھانا کھا رہے تھے کھانے میں جَو کی روٹی تھی۔ حضرت عقبہ نے کہا کہ امیر المومنین! آپ جَو کی روٹی کیوں کھاتے ہیں، گیہوں کی کیوں نہیں کھاتے۔ آپ نے کہا کہ فرقد! کیا تمام مملکت کے افراد کو گیہوں کی روٹی میسر آرہی ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایسا تو نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ فرقد! عمرؓ کس قدر بُرا حاکم ہوگا کہ رعایا تو جَو کی روٹی کھائے اور عمرؓ گیہوں کی۔ عمرؓ اُس دن گیہوں کی روٹی کھائے گا جب تمام افرادِ مملکت کو گیہوں کی روٹی ملنے لگے گی۔ (طبری۔ عہدِ فاروقی)

یہ ہے مساواتِ محمدی کا عملی مفہوم۔ اسلامی مملکت میں وسائل کے مطابق، معیارِ زندگی متعین کر لیا جائے گا۔ اور یہ معیار، مملکت کے تمام افراد کا ایک جیسا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ آغازِ کار میں اس کا نقشہ وہ ہو جسے حضرت ابوموسےٰ اشعریؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

> اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں کھانا تھوڑا رہ جاتا، یا کسی اور وجہ سے سامانِ خورد و نوش میں کمی واقع ہو جاتی تو یہ لوگ کھانے پینے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں رکھ کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔
>
> (صحیحین)

جوں جوں مملکت کے وسائل زیادہ ہوتے جائیں گے، یہ معیار بلند ہوتا جائے گا حتیٰ کہ یہ اس مقام تک پہنچ جائے گا جسے قرآن نے تمثیلاً جنت کی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ اس معاشرہ کے متعلق کہا ہے کہ اس میں شہد اور دودھ کی نہریں ہوں گی۔ پھلدار درختوں کی شاخیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ پرندوں کا گوشت کھانے کو، عمدہ ترین لباس پہننے کو ہوگا، حریر و اطلس کے پردے۔ مخمل اور کمخواب کے صوفے، اور اعلیٰ درجہ کے قالین زینتِ فرش ہوں گے۔ لیکن یہ سامان تمام اہلِ جنت کو یکساں طور پر میسر ہوگا۔ جنت کے متعلق یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اس میں ایک طبقہ کو یہ کچھ میسر ہوگا اور دوسرا طبقہ نانِ جویں پر گذارہ کرتا ہوگا۔ جہاں تک ان کی "انسانی زندگی" کا تعلق ہے، اعمال کے مطابق ان کے مدارج میں تفاوت ہوگا۔ لیکن جہاں تک زندگی کی طبیعی ضروریات کا تعلق ہے، وہ سب کے لئے یکساں موجود ہوں گی۔ (طبیعی زندگی کی ضروریات میں حسنِ ذوق ...... (AESTHETIC TASTE) بھی شامل ہے)۔ یہی وہ اصول ہے جسے حضرت صدیقِ اکبرؓ نے وظائف کے تعین کے سلسلہ میں اختیار فرمایا تھا۔ آپ نے ہر ایک کی ضرورت کے مطابق وظیفہ مقرر کیا۔ اس پر بعض حضرات نے کہا کہ جن لوگوں نے اسلام کی زیادہ خدمت کی تھی۔ جنگوں میں زیادہ حصہ لیا تھا، انہیں زیادہ ملنا چاہیئے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں کو ان کی خدمات کا صلہ خدا کے ہاں سے ملے گا۔ ہم معاشی تقسیم کر رہے ہیں۔ اس میں ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملنا چاہیئے۔ یہ ہے مساواتِ محمدی کا اصول۔

سوشلسٹ طبقہ بڑے فخر سے کہتا ہے کہ مارکس نے ایک ایسا معاشی اصول دیا ہے جو اس باب میں حرفِ آخر ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ:

> ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے گا اور اس کی ضروریات کے مطابق اُسے دیا جائیگا۔

انہیں کون بتائے کہ یہ اصول مارکس کا دیا ہوا نہیں، محمد رسول اللہ کا عطا کردہ ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ مارکس نے یہ اصول تو بیان کر دیا لیکن یہ نہ بتا سکا کہ اس پر عمل کس طرح سے ہوگا۔ اس سوال نے اُسے کس قدر طلسم پیچ و تاب بنا رکھا

تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود اس کی زندگی میں اس کی اپنی پارٹی کے لوگ جب اس سے یہ سوال کرتے تو وہ جھلا اٹھتا اور انہیں (UTOPIANS) "خوابوں کی دنیا میں بسنے والے" کہہ کر جھڑک دیتا۔ مارکس کے بعد جب لینن سے یہی سوال کیا گیا تو اس نے بار تھک کر اعتراف کر لیا کہ

نوعِ انسان کن مراحل سے گذر کر اور کن عملی اقدامات کی رُو سے اس بلند مقصد کو حاصل کر سکے گی۔ اس کی بابت ہم نہ کچھ جانتے ہیں نہ جان سکتے ہیں، اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی میٹریل ایسا نہیں جس سے ان سوالات کا جواب دیا جا سکے[1]

اس کے برعکس، نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے جانشینوں نے عملاً بنا دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ اُس دور میں وظائف کا تعین اس اصول کی عملی تفسیر تھا۔ میں اپنے موضوع سے دُور نکل جاؤں گا ورنہ میں تفصیل سے بتاتا کہ آج اس اصول پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ اس اصول کو کوئی ایسا نظام عمل میں نہیں لا سکتا جس میں محنت کا معاوضہ اُجرت (WAGES) کی شکل میں ادا کیا جائے۔ حیرت ہے کہ سوشلسٹ حضرات، نظامِ سرمایہ داری کی مخالفت تو اس شدومد سے کرتے ہیں لیکن اپنے معاشی نظام میں، محنت کا معاوضہ اُجرتوں کی رُو سے متعین کرتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ یہ اصول، نظامِ سرمایہ داری کی تخلیق ہے۔ ان سے پوچھئے کہ وہ کونسا معیار ہے جس کی رُو سے آپ یہ طے کرتے ہیں کہ ایک مزدور کی اُجرت پانچ روپے یومیہ ہوگی اور سپروائزر کی اتنے ہی وقت کی اُجرت، دس روپے۔ نظامِ سرمایہ داری تو اس کا جواب نہایت آسانی سے دے دیگا کہ سوال سارا طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND) کا ہے لیکن سوشلزم اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے گی۔ مارکس نے اس کے جواب میں ایک اصول تو بیان کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف کر لیا کہ وہ نہیں جانتا کہ اس پر عمل پیرا کس طرح ہوا جائے گا۔ مساواتِ محمدیؐ نے یہ اصول بھی دیا اور اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا۔ یعنی ہر ایک کا وظیفہ اس کی ضرورت کے مطابق مقرر کر دیا۔ اس نظام میں بنیادی ضروریات میں مساوات کی یہ کیفیت ہوگی، البتہ جس شخص کے سپرد جو کام کیا جائے گا اُس کی سرانجام دہی کے لئے اسے جس قدر سامان اور وسائل کی ضرورت ہوگی وہ اسے الگ مہیا کیا جائے گا۔ اس میں فرائض کے لحاظ سے تفاوت ہوگا۔

یہ ہے اسلامی نظام کا اصولی تصور۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں، نہ ذرائع پیداوار کسی کی ذاتی ملکیت ہوں گے، نہ وہاں جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہوگا۔ آج حالت یہ ہے کہ ہمارے اربابِ شریعت، منبر و محراب سے مساواتِ محمدیؐ کے وعظ کہتے نہیں تھکتے، لیکن اس کے ساتھ ہی فتوے یہ دیتے ہیں کہ اسلام میں ہر شخص زمین، عمارات، جائیداد، روپیہ پیسہ بے حد و حساب ذاتی ملکیت میں رکھ سکتا ہے۔ وہ اس نظامِ سرمایہ داری کے تحفظ میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ذاتی جائیداد کی تقدیس (SANCTITY OF PRIVATE PROPERTY) کو فرمانِ خداوندی قرار دیتے ہیں۔ ہم ان حضرات سے صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ

حضورؐ کی زندگی

(i) نبی اکرمؐ کی ذاتی ملکیت میں کتنی زمین تھی ؟

(ii) حضورؐ نے کون کونسی جائیدادیں بنائی تھیں؟

(iii) آپؐ نے کس قدر مال و دولت اپنے ترکہ میں چھوڑا تھا۔ ؟

[1] مزید تفصیل اور حوالوں کے لئے دیکھئے میرا مقالہ "اسلامی سوشلزم"۔

ان سوالات کا جواب ذاتی جائیداد کی تقدیس کے دعویٰ کی قلعی کھول دے گا۔ اگر وہ ان سوالات کا جواب نہ دینا چاہیں تو ہم ان سے پوچھنا چاہیں گے کہ کیا وہ اُن احادیث کو بھی صحیح مانتے ہیں یا نہیں جن میں کہا گیا ہے کہ

(۱) حضورؐ نے فرمایا کہ میرے ورثا میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی ضروریات کے بعد جو کچھ بچے وہ صدقہ ہوگا۔ (بخاری)

(۲) دوسری روایت میں ہے کہ مرض الموت کے دوران حضورؐ کے ہاں سات دینار تھے۔ اور آپ فرماتے تھے کہ انہیں صدقہ کر دو۔ لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہو گئی۔ اور سب آپؐ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ آپ کو ہوش آیا تو فرمایا کہ وہ دینار لے آؤ۔ دینار کو آپؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ محمدؐ کا اپنے رب پر کیا گمان ہوگا جبکہ وہ رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ہوں۔ پھر حضورؐ نے انہیں خود صدقہ کر دیا۔ (یعنی دوسروں کی ضروریات کے لئے بیت المال میں بھیجدیا)

(۳) بخاری ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ آنحضرتؐ نے نہ درہم چھوڑا نہ دینار۔ نہ بکری نہ اونٹ۔ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا نہ درہم۔ نہ غلام نہ لونڈی، اور نہ کوئی اور چیز سوائے ایک خچر اور ہتھیاروں کے۔ اور اس زمین کے جسے آپؐ نے صدقہ کر دیا تھا۔

کیا حضورؐ کے اس عملی نمونہ کے بعد ذاتی جائیداد کی تقدیس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، اسلامی نظام میں تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا مملکت کا فریضہ ہوگا۔ اس لئے اس میں افراد کے لئے جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ ان ضروریات کی مقدار میں تو فرق ہوگا لیکن افرادِ معاشرہ کے معیار میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ یہ ہے رزق کی مساوات کا صحیح مفہوم۔

لیکن مساواتِ محمدیہ صرف رزق کی مساوات کا نام نہیں۔ اس میں رزق کا کریم ہونا بھی ضروری ہے اور رزق کے کریم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس معاشرہ میں کسی کی عزتِ نفس کو ذرا سی بھی ٹھیس نہ لگے۔ مساواتِ محمدیؐ کی بنیاد شرف و تکریم انسانیت اور احترامِ آدمیت ہے۔ اس کا سرچشمہ قلب و نگاہ کی وہ تبدیلی ہے جو اقدارِ خداوندی پر ایمان اور سیرتِ محمدیہ کے اتباع سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے مارکس کی اشتراکیت اور مساواتِ محمدیہ کا مقابلہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است — بیخ او در دل نہ در آب و گل است

جس نظام کی بنیاد احترامِ آدمیت پر نہ ہو اس میں مساواتِ محمدیؐ کا نام لینا اس بلند و بالا اور مقدس و مطہر تصور کی توہین ہے۔ ذہنِ انسانی کے وضع کردہ نظریات کے ساتھ ان پاکیزہ اصطلاحات کے چسپاں کرنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ دنیا انہی انسان کے وضع کردہ نظریات کو عین اسلام اور ماحصل نبوتِ محمدیہ سمجھ لیتی ہے اور اس طرح محمدیؐ نظریات آسمان کی بلندیوں سے خاک کی پستیوں میں آ گرتے ہیں۔ اور جب وہ انسانی نظریات جن

کے ساتھ ان اصطلاحات کو چپکا دیا جاتا ہے ناکام رہ جاتے ہیں تو اپنے اور بیگانے سب اسے خود اسلام کی ناکامی پر محمول کر لیتے ہیں۔ لہٰذا کسی تصور، نظریہ یا نظام کو محمدؐ کی طرف منسوب کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ احتیاط جسے مقامِ محمدی کے شناسا، اقبالؒ نے ان جگر سوز الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

چوں بنامِ مصطفٰےؐ خوانم درود از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ "اے محکومِ غیر سینۂ تو از بتاں مانندِ دیر
تا نداری از محمدؐ رنگ و بو
از درودِ خود میالا نامِ او"

آج مساواتِ محمدی کا عکس دنیا کے کسی معاشرہ میں بھی دکھائی نہیں دیتا۔ خدا کرے کہ ہم پاکستان کو ایسا بنا سکیں۔

(والسلام)

معراجِ انسانیت

سیرتِ صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) خود قرآن کے آئینے میں مفکرِ قرآن کا بلند پایہ شاہکار۔ عقل و عشق، فکر و نظر، دل اور دماغ کا حسین امتزاج۔ اس سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے مقامِ محمدی اور انقلابِ محمدی نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

حسنِ معنوی کے ساتھ صوری پاکیزگی بھی دیدہ زیب، بڑی تقطیع، اعلیٰ درجہ کا سفید کاغذ۔ ضخامت پانصد صفحات۔ کتابت طباعت نورانی۔ جلد مضبوط اور دلکش۔

قیمت:۔ بیس روپے ۲۰/- (علاوہ محصول ڈاک)

مکتبہ دین و دانش، چوک اردو بازار، لاہور ۔ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲، لاہور

بقیہ تفہیم القرآن پر تبصرہ صفحہ ۵۸ سے مسلسل

ہوئے مودودی صاحب نے اپنی کتاب "حقوق الزوجین" میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ "اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم قرار نہ دیا جائے" (صفحہ ۱۰۹) لیکن وہ اپنی اس تفسیر میں اس کے بالکل الٹ مسلک پیش کرتے ہیں۔ سورۃ الطلاق کی آیت وَّ الّٰٓئِیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ (اور یہی حکم ان کا ہے کہ جنہیں حیض نہ آ سکا ہو) کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

"اس جگہ یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ قرآن مجید کی تصریح کے مطابق عدت کا سوال اُس عورت کے معاملے میں پیدا ہوتا ہے جس سے شوہر خلوت کر چکا ہو۔ کیونکہ خلوت سے پہلے طلاق کی صورت میں سرے سے کوئی عدت ہے ہی نہیں (الاحزاب - ۴۹) اس لئے ایسی لڑکیوں کی عدت بیان کرنا جنہیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو، صریحاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اِس عمر میں نہ صرف لڑکی کا نکاح کر دینا جائز ہے بلکہ شوہر کا اسکے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس چیز کو قرآن نے جائز قرار دیا ہو اُسے ممنوع قرار دینے کا کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا" (صفحہ ۵۷۱)

اب بھی اگر قوم ان کو مفکر اسلام تسلیم کرے تو یہ قوم کی بدنصیبی ہے!

قرآن مجید نے مطلقہ کی عدت تین حیض قرار دی ہے۔ یعنی اس نے عدت شمار کرنے کے لئے حیض کو پیمانہ بنایا ہے۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو عورتیں اس قدر سن رسیدہ ہو گئی ہوں کہ انہیں حیض آنا بند ہو چکا ہو تو ان کی صورت میں عدت کا شمار کس طرح کیا جائے گا۔ فرمایا کہ ان کی عدت تین حیض کے بجائے تین مہینے ہوگی (۶۵/۴) اس کے بعد ایک شق اور رہ گئی یعنی وہ عورتیں جو سن رسیدہ تو نہیں لیکن بعض وجوہات (بیماری وغیرہ) کی بنا پر انہیں حیض آ ہی نہیں سکا۔ تو ان کے متعلق فرمایا کہ وَّ الّٰٓئِیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ ۔ (۶۵/۴) جنہیں حیض آ نہیں سکا ان کی بھی عدت تین حیض کے بجائے تین مہینے ہی ہو گی۔

اب مودودی صاحب جو کفار کی نابالغ لڑکیوں کو جنت کی حوریں بنا کر ان سے لذت اندوز ہونا چاہتے ہیں، اس دنیا میں بھی ایسی صورت پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن قرآن کی کسی آیت سے اس کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ قرآن کریم نکاح کے لئے بلوغت کو لازمی شرط قرار دیتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے اس آیت میں پہلے لَمۡ یَحِضۡنَ کا ترجمہ یہ کیا کہ "جن عورتوں کو حیض نہیں آیا"۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ یہ نابالغ لڑکیاں ہی ہو سکتی ہیں۔ اس سے انہوں نے نابالغ لڑکیوں سے نکاح کی اجازت ثابت کر دی۔ اور اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی فرما دیا کہ شوہروں کا ان نابالغ بچیوں کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ عرصہ کی بات ہے، ایک امریکی مصنفہ نے (MOTHER - INDIA) کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں ہندو تہذیب کے مختلف گوشوں کی جھلک دکھائی گئی تھی۔ اس میں ایک باب میں حقیقی واقعات کی روشنی میں بتایا گیا تھا کہ ہندو دھرم کے مطابق نابالغ لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے اور اس کے بعد جب ان کے شوہر ان سے مباشرت کرتے ہیں تو اس سے ان بیچاریوں پر کیا بیتتی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ہندو اس قدر شرمسار ہوئے کہ انہوں نے ساردا ایکٹ پاس کرایا جس کی رُو سے صغر سنی کی شادیاں ممنوع قرار دے دی گئیں حالانکہ یہ ان کے دھرم کا تقاضا تھا۔ اب ہمارے یہ مفکر انہی انسانیت سوز واقعات کو دہرانے کے لئے اٹھے ہیں اور قیامت بالائے قیامت کہ اسے اسلام کا تقاضا کہہ کر پیش کر رہے ہیں۔

ہم مودودی صاحب سے تو کچھ عرض کرنا بیکار سمجھتے ہیں لیکن پوچھنا چاہتے ہیں ان دانشورانِ قوم سے جنہوں نے اس تفسیر کی تکمیل کی تقاریب جشن میں اسے بلند ترین تفسیر قرار دیا تھا کہ کیا مودودی صاحب کی اس تفسیر کو دیکھ کر ان کی نگاہوں میں کبھی حیاء کا جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا؟

اور یہ ہیں "خدا اور رسول کے وہ احکام" جن کی مخالفت کرنے والوں کی سزا مودودی صاحب "قتل" تجویز فرما رہے ہیں!

اور یہ ہے وہ "اسلامی نظام" جسے یہ حضرات پاکستان میں رائج کرنے کے لئے اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں!

اس تفسیر کی چھٹی اور آخری جلد پر تبصرہ آئندہ پیش کیا جائے گا۔

شکریہ — پرسشِ غم کا

میں احباب کے خطوط کا جواب التزاماً ذاتی طور پر دیا کرتا ہوں۔ لیکن والدہ مرحومہ کی وفات پر مجھے تعزیت کے جو خطوط موصول ہوئے ہیں وہ اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ انفرادی طور پر ان کا جواب لکھنا میرے لئے ناممکن ہے۔ بنابریں، میں جملہ احباب کا اجتماعی طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے غم میں شرکت سے اس کے جانگداز اثر کو بڑی حد تک زائل کر دیا۔ اس قسم کے مخلص ہمدرد دوستوں کی موجودگی کا احساس انسان کے لئے بڑا تقویت بخش ہوتا ہے۔

والسلام　　رہینِ کرم — پرویز

رشتہ کی ضرورت

ایک پاکیزہ فکر نوجوان کے لئے جس کے کوائف حسب ذیل ہیں، رشتہ کی ضرورت ہے:-

۱۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ جیالوجسٹ　　۲۔ تنخواہ قریب ایک ہزار روپیہ ماہوار

۳۔ عمر۔ تیس سال　　۴۔ مستقل رہائش پنجاب۔ سردست ملازمت کوئٹہ

رفیقۂ حیات کی شرائط:-

(۱) تعلیم یافتہ (نرس یا ڈاکٹر ہو تو زیادہ بہتر ہے)

(۲) تشریح نی فکر کی حامل۔　　(۳) عمر قریب چوبیس سال

(۴) خدمتِ خلق کا جذبہ اور غریبوں اور محروموں کی غمگسار۔

(۵) ذات پات کی کوئی تمیز نہیں۔ غریب خاندان کو ترجیح دی جائے گی۔

خط و کتابت بصیغۂ راز — (م۔ ا) معرفت طلوعِ اسلام۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

INSURE » with

Sterling Insurance Coy. Ltd.

TRANSACTS : MOTOR, FIRE, MARINE
& MISC : INSURANCES

BRANCHES ALL OVER PAKISTAN

HEAD OFFICE :
26, Shahrah-e-Quaid-e-Azam
P.O. Box No. 119, LAHORE
Telephone No. 54245

KARACHI OFFICE :
503-504, Muhammadi House
I.I, Chundrigar Road, KARACHI
Telephone Nos. 231971, 224525

پرویز صاحب کی معرکہ آرا انگریزی کتاب

ISLAM : A CHALLENGE
TO RELIGION.

جس نے اپنے ملک کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے ارباب فکر و نظر سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔

قیمت :- (بکس بورڈ کور) -/۲۰ روپے
قیمت :- (خوبصورت جلد کیساتھ) -/۳۰ روپے
محصولڈاک اور پیکنگ علاوہ
جلد حاصل کیجئے۔

ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵ بی۔ گلبرگ ۲، لاہور

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دکان

سٹینڈرڈ آٹوموبائلز

پر تشریف لائیے!

ڈیلرز موٹر پارٹس
ٹرک (ڈیزل) پارٹس

سپیشلسٹ ڈاج، بیڈفورڈ، لی لینڈ
اے۔ ایل۔ ایم۔ سی

۱۳۵۔ بادامی باغ لاہور ٹیلیفون 69012

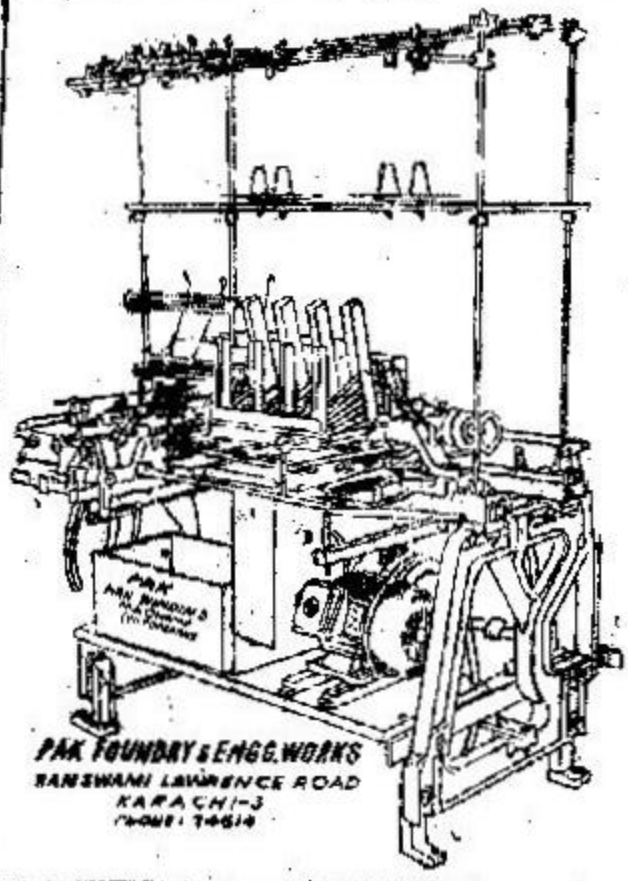

SOLE MANUFACTURERS
OF
FOUR SPINDLE
AUTOMATIC
PIRN WINDING
MACHINES

PAK FOUNDRY

AND

ENG^{G} WORKS

RAMSWAMY

Lawrence Road, KARACHI-3

Phone : 74614

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۔

O ye who believe! Fear God as He should be feared and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves

PREMIER TOBACCO
INDUSTRIES LIMITED